اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو: مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی آرا کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم فل علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

محمد ادریس

ایم فل، علومِ اسلامیہ

رجسٹریشن نمبر:1512MPhil/IS/S18

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

دسمبر، 2021ء

اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو: مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی آرا کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم فل علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

محمد ادریس

ایم فل سکالر شعبہ علومِ اسلامیہ

رجسٹریشن نمبر:1519MPhil/IS/S18

نگران مقالہ

ڈاکٹر سید محمد شاہد ترمذی

لیکچرار شعبہ علوم اسلامیہ

نمل اسلام آباد

یہ مقالہ ایم فل علوم اسلامیہ کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا ہے

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

© (محمد ادریس، 2021ء)

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: **اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو: مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی آرا کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ**

Translation of title in English:

Reconstruction of the Islamic State :Analytical Study In the Light of theViews of Maulana Maududi and Dr. Israr Ahmed

نام ڈگری: ماسٹر اف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: محمد ادریس

رجسٹریشن نمبر: 1519MPhil/IS/S18

ڈاکٹر سید محمد شاہد ترمذی _____

(نگران مقالہ) دستخط نگران مقالہ

ڈاکٹر نور حیات خان _____

(صدر، شعبہ علوم اسلامیہ) دستخط صدر، شعبہ علوم اسلامیہ

پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی _____

(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان _____

(پرو-ریکٹر اکڈیمکس) دستخط پرو-ریکٹر اکڈیمکس

تاریخ: _____

حلف نامہ فارم

(Candidate declaration form)

میں **محمد ادریس** ولد **محمد نواز**

رول نمبر: MPhil-IS-(S18)-307 رجسٹریشن نمبر:1519Mphil/IS/18

طالب، ایم فل شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز(نمل)اسلام آباد حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ

مقالہ بعنوان: **اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو: مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی آرا کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ**

Translation of title in English and Roman:

Reconstruction of the Islamic State :Analytical Study In the Light of theViews of Maulana Maududi and Dr. Israr Ahmed
Islami Riyasat ki Tashkeel Nao :Maulana Maudodi aor Dr Isras Ahmad ki Araa ki Roshni meTajziayati Mutali

ایم فل علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے، اور **ڈاکٹر سید محمد شاہد ترمذی** کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کروایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لئے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

میں اس بات کو سمجھتی ہوں کہ ایچ ای سی اور نمل علمی سرقہ کے حوالے سے عدم برداشت کی پالیسی پر سختی سے عمل پیرا ہے۔ اس لیے میں بطور مقالہ نگار اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی علمی کام ہے۔ اس مقالہ کا کوئی حصہ بھی سرقہ شدہ نہیں ہے۔ اور میں نے جہاں سے بھی کسی علمی کام کو لیا ہے اس کا باقاعدہ حوالہ دیا ہے۔ میں اس بات کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ اگر میرے مقالے میں کسی بھی قسم کا باقاعدہ علمی سرقہ پایا جائے تو یونیورسٹی میری ڈگری کو ختم کرنے والیس لینے کا اختیار رکھتی ہے۔

نام مقالہ نگار: **محمد ادریس**

دستخط مقالہ نگار: _____

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

Abstract

Syed Maududi was a journalist, Scholar, Politician, Educationist and author. Dr Israr was a scholar and author as well. Both worked for the establishment of the Islamic state in Pakistan. Syed Maududi was in favour of Islamic democracy. According to him, it is allowed in Islam for an eligible person to present himself in front of people for the designation of political leadership. Islamic legislation is to be done under the light of the Quran and Sunnah. This task can be achieved by only Muslims and non-Muslim cannot be accepted as the ruler of the Islamic State. Syed Maududi has mentioned other attributes of the ruler of the Islamic state. According to him, only those people can be taken into Islamic Parliament "Shoora" who are well aware of Islamic Sciences and they are clean in character. Islamic state is a welfare state which is responsible to provide a balanced life, social justice, establishing the system of Islamic worship, Islamic economical system and a system in which propagation of Islam can be performed. An Islamic state must be constituted under Islamic law. According to him the nationalism on the basis of creed, language and geography is not in the favour of human beings. It creates clashes between them. He prefers the concept of Ummah given by Islam. Its prime base is on equality. He has presented various examples from the teachings and life of Prophet Muhammad ﷺ which support the concept of Ummah.

Dr. Israr Ahmed is in favour of the presidential system as, according to him, it is more close to the Islamic concept of Khalifa because both are independent in working in their domains. He is not in favour of traditional democracy. The presidential system is enforced in America. The selection of a president is done by an electoral system and every citizen has the authority to vote. In the same way in an Islamic state, all citizens should be allowed to vote. According to Dr. Israr Ahmed, the capital system of the economy is close to the Islamic economical system. It gives freedom to make countless asserts. Dr Israr Ahmed has presented his philosophy of the revolution in seven steps.

Dr. Israr Ahmed & Syed Maududi both agreed upon that sovereignty belongs to Allah. They have differed about the traditional democracy. Both have rejected the secrecy of religion and they do not believe in the opinion that religion is a private matter of men. Both agree that if the ruler of parliament passes any law which is against Islam, anyone from the public can raise his voice against it and he can go to the court to get that law removed.

فہرست عنوانات

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کی منظوری کا فارم(Thesis Acceptance Form)	iv
حلف نامہ(Declaration)	v
ملخص مقالہ(Abstract)	vi
فہرست عنوانات(Table of Contents)	viii
اظہار تشکر(A word of thanks)	xiv
انتساب(Dedication)	xv
مقدمہ	1
باب اول: مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار کا تصور اسلامی ریاست	4
فصل اول: مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کا تعارف و خدمات	5
سید ابو الاعلیٰ مودودی کا تعارف و خدمات	5
ڈاکٹر اسرار احمد کا تعارف و خدمات	10
فصل دوم: اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد	16
ریاست کی تعریف	16
اسلامی ریاست کے قیام کے انتظامی مقاصد	18
اسلامی نظریاتی قانون کا نفاذ	18
نماز قائم کرنا	20
زکوۃ دینا(اسلامی معاشی نظام کا نفاذ)	22
امر بالمعروف و نہی عن المنکر	22
ناپ تول میں وزن کی برابری رکھنا(تجارتی امور میں دیانت داری کو قائم کرنا)	24
انصاف قائم کرنا(عدالتی نظام کو غیر جانبدار رکھنا)	24
اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیات	26
خطہ زمین پر خدا کی نیابت	26

پارلیمانی نظام	27
انسانی حقوق کی پاسداری	29
جان کا تحفظ	29
مال کا تحفظ	30
عزت کا تحفظ	31
نجی زندگی کا تحفظ	32
دعوت و تبلیغ کے حق کا تحفظ	33
مذہبی آزادی کے حق کا تحفظ	34
محض اپنے اعمال کے احتساب کی ذمہ داری	**36**
مفلس و نادار طبقے کی کفالت کا حق	**37**
حکمرانِ وقت کی فرماں برداری	**37**
قوانینِ ریاست کی پابندی	**38**
فصل سوم: مسلمان ممالک میں روبہ عمل سیاسی نظام	**40**
ملائشیا	**41**
ترکی	**43**
مصر	**47**
مشرقِ وسطیٰ اور عرب ممالک	**48**
وسطی ایشیا	**49**
جنوبی اور مشرقی جنوبی ایشیا	**50**
باب دوم: اسلامی ریاست کی تشکیل نو اور مولانا مودودی کے افکار	**51**
فصل اوّل: اسلامی ریاست اور تصوّرِ قومیت	**52**
سیّد مودودی کے افکار کی روشنی میں	**52**
قومیت کا مفہوم	**52**
مغرب کا تصورِ قومیت	**53**
جدید قومیت کی تشکیل کے عناصرِ ترکیبی	**57**

معاصر قومی تصوّرات پر سید مودودی کا محاکمہ	58
مغربی قومیت اور اسلامی مؤقف	62
فصل دوم: اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیادیں	68
سید مودودی کے افکار کی روشنی میں	68
ریاستی نظریہ سے متعلق انسانی المیہ	69
اسلامی ریاست کی نظریاتی اساس اور سیاسی پارٹیاں	70
اسلامی ریاست میں پارٹی سازی	71
فصل سوم: اسلامی ریاست کا انتظامی ڈھانچہ (پارلیمان)	75
اسلامی ریاست کی انتظامیہ	75
اسلامی ریاست کی انتظامیہ کی نوعیت	77
انتخابات کے وقت ملحوظ رکھنی جانے والی شرائط	78
اسلامی ریاست کی انتظامیہ کے اختیارات کی تحدید	82
اسلامی ریاست کی انتظامیہ کی ذمہ داریاں	84
اسلامی ریاست کی انتظامیہ کا دائرہ کار	86
سماجی انصاف	86
افراد کی نجی زندگی کا لحاظ	86
حکومت نہیں خدمت	87
منتظمین کا باعمل کردار	87
خلیفہ کا دائرہ اختیار	87
باب سوم: اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو اور ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار	92
فصل اول: اقامت دین کے انقلاب: عملی جدوجہد	83
انقلابی نظریہ کی تشکیل	94
انقلابی نظریہ کی نشر واشاعت اور تبلیغ	95
تنظیم وتربیت	95
مزاحمت پر صبر	97

اقدامی کاروائی	98
توسیعی و تصدیری مرحلہ	101
فصل دوم: اسلامی ریاست کی معاشی و معاشرتی بنیادیں	103
معاشی نظام کا مادی اور روحانی پہلو	103
سرمایہ دارانہ نظام کی خوبیاں	104
سرمایہ کاری اور سرمایہ داری	105
مروجہ نظام مزارعت	108
اسلامی ریاست میں ٹیکس کا نظام	111
اسلامی ریاست میں بینکاری	113
فصل سوم: اسلامی ریاست کا سیاسی ڈھانچہ	115
صدارتی نظام حکومت	115
مروجہ پارلیمانی نظام کی نفی	116
صدر کے انتخاب کا طریقہ	117
ڈاکٹر اسرار احمد کے مؤقف کا تجزیہ	118
مقننہ کی نوعیت	120
ڈاکٹر اسرار احمد کے مؤقف کا تجزیہ	122
باب چہارم: مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار کا تقابلی جائزہ	125
فصل اول: اقامت دین اور خلافت کے لئے کوششوں کے اثرات کا جائزہ	126
اقامت دین کے لئے سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تحریری کوششیں	126
اقامت دین کے لئے سید ابو الاعلیٰ مودودی کی سیاسی کوششیں	127
اسلامی قانون سازی میں سید مودودی کا کردار	127
قادیانی مسئلہ	129
سید مودودی کی جمہوریت پسندی پر علماء تحفظات	130
غیر اسلامی قانون سازی کے خلاف سید مودودی کی مزاحمت	130
اشتراکیت پسندوں کے ساتھ سید مودودی کا تنازع	131

اسلامی نظام کے لئے دعوتی سرگرمیاں	132
اقامت دین کے لئے ڈاکٹر اسرار احمد کی کوششیں	133
جماعت اسلامی میں شمولیت	133
درسِ قرآن کے حلقے	135
دار الاشاعت کا قیام	135
انتخابات میں حصہ لینے کی دعوت	136
تنظیم اسلامی کا قیام	136
شریعت بل کی مخالفت	138
تحریک خلافت کا قیام	138
حکومتِ وقت کو پند و نصیحت	140
فصل دوم: تشکیل ریاست سے متعلق افکار میں مشترکات اور متفرقات	142
سید مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے فکری روابط	142
اسلامی ریاست کی تعریف	143
اسلامی ریاست اور جمہوریت	145
اسلامی ریاست اور حکمران	147
اسلامی ریاست کی پارلیمان	149
اسلامی ریاست میں شخصی آزادی کی حدود	151
اسلامی نظام کے نفاذ کی اہمیت	151
اسلامی ریاست کی شہریت	152
اسلامی ریاست کے قیام کی ناگزیریت	154
اسلامی ریاست کے انتظامی قانون کی تشکیل	155
اسلامی ریاست کے دستور کی تشکیل	156
اسلامی ریاست کا عدالتی نظام	157
فصل سوم: موجودہ اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو	159
اسلامی ریاست کی ماہیت	162

اسلامی ریاست میں حاکمیت اعلیٰ کا تصوّر	163
اسلامی ریاست میں قانون سازی	164
اسلامی ریاست میں حکومت کی تشکیل	164
طریق انتخاب	165
وزارتوں کا تقرر	167
پارلیمان کی تشکیل	168
عدالتی نظام کی تشکیل	171
اسلامی ریاست کا دفاعی نظام	171
خلاصہ بحث	172
نتائج بحث	179
سفارشات	180
فہارس	181
فہرست آیات	182
فہرست احادیث	185
فہرست اعلام	186
فہرست اماکن	188
فہرست مصادر و مراجع	190

اظہار تشکر (A word of thanks)

الْحَمد لله رب الْعَالمين وَالصَّلَاة وَالسَّلَام على سيدنَا مُحَمَّد وَآله وَصَحبه أَجْمَعِينَ۔

امابعد:!

"من لم يشكر الناس لم يشكر الله" (جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔)

تمام تعریفیں صرف اور صرف اس واحد ذات اور معبود حقیقی کے لیے ہیں جس نے اپنی بے پایاں رحمتوں اور نوازشوں سے مجھے علم دین حاصل کرنے کی توفیق بخشی، اور ہزاروں درود و سلام حضرت محمد ﷺ پر جن کی محبت مسلمانوں کا فخر ہے۔ بعد ازاں میں اپنے والدین کی شکر گزار ہوں جن کی تربیت نے مجھے علوم اسلامیہ کی تدریس کی طرف مائل کیا اور ان کی وجہ سے مجھے دین اسلام کو سمجھنے اور عملی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کا موقع ملا۔ میں اپنے نہایت شفیق دوست اور بھائی بہنوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی تربیت اور سرپرستی میں اس مقام تک پہنچا کہ آج قلم اٹھانے کے قابل ہوا اور جن کی مسلسل مدد اور رہنمائی سے میں نے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد سے ایم فل علوم اسلامیہ کی تکمیل کی۔

میں صدر شعبہِ جناب ڈاکٹر نور حیات خان صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ جن کی راہنمائی ادارتی اور موضوع کے انتخاب میں میرے شامل حال رہی، اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے نگرانِ مقالہ جناب ڈاکٹر سید محمد شاہد ترمذی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے تحقیقی عمل میں نہ صرف میری رہنمائی کی بلکہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر مجھے وقت دیا اور انتخاب موضوع اور سفارشات مرتب کرنے تک ہر مرحلے میں میری مکمل رہنمائی کی۔ اسی طرح میں ڈیپارٹمنٹ کے باقی اساتذہ کرام، لائبریریوں کے عملے، فیملی کے ارکان، بہن بھائی، کلاس فیلوز اور وہ لوگ جنہوں نے کسی بھی طرح مجھ سے تعاون کیا، کے لیے شکریہ کے کلمات کے ساتھ ساتھ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ان کے علم و عمل میں ترقیاں عطا فرمائے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا ہے کہ میری اس ادنیٰ سی کوشش کو قبول فرمائے۔ (آمین)

محمد ادریس

طالب ایم فل علوم اسلامیہ

انتساب(Dedication)

اللہ پاک کے کروڑ ہا شکر کے بعد میں اپنی اس کاوش کو اپنے محترم و مکرم والدین، قابل احترام اساتذہ کرام، شفیق دوست اور بھائی بہنوں کے نام منسوب کرتا ہوں کہ جن کی دعاؤں، بے پناہ محبت اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں اس قابل ہوا کہ ایم فل علوم اسلامیہ کی تکمیل کر سکوں۔

مقدمہ

إن الحمد لله، نحمده، ونستعينه، ونستغفره، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضل له، ومن يضلل فلا هادي له، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمدا عبده ورسوله.

أما بعد:

موضوع کا تعارف

اسلام دین فطرت ہے دین اسلام زندگی کے ہر شعبے سیاست، معاشرت،، معیشت میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہر شعبے کے کچھ اصول اور حدود مقرر کیے گئے ہیں اس طرح اسلام نے ایک فلاحی ریاست کے خدوخال کو بھی بیان کیا ہے اور اس کی زندہ مثال خلفاء راشدین اور اس کے بعد کچھ اسلامی ریاست کی شکل میں ملتی ہے اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ ان سنہرے ادوار میں سے ہے جس میں رعایا اپنے حکمرانوں سے خوش تھے اور حکمرانوں نے قرآن و سنت کے اصولوں کو اپنانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ﴾[1]

ترجمہ: اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔

ریاست سے مراد ریاست کا وہ تصور جس میں ایک ریاست تمام شہریوں کو تحفظ اور شہریوں کی بہتری کے لیے ذمہ داری لیتی ہے۔ ایک ریاست اپنے شہریوں کی جانی، مالی تحفظ کو اپنی اولین ترجیح قرار دیتی ہے۔

ریاست کا قیام اس لیے عمل میں لایا جاتا ہے کہ مخصوص علاقہ میں آباد افراد کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا پورا پورا موقع ملے اور وہ امن اور سکون کی فضا میں اپنی زندگی گزار سکیں۔ جیسا کہ عنوان سے واضح ہے کہ اس بحث کا موضوع عصر حاضر کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک جدید اسلامی ریاست کی تشکیل نو اور اس کے بارے میں دور حاضر کے دو بڑے مفکرین، ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودی کی آراء کا مطالعہ ہے۔

موضوع کی ضرورت اور اہمیت

اسلام ایک مکمل دین اور کامل دستورِ حیات ہے۔ اسلام جس طرح فرد کی انفرادی زندگی کی اصلاح پر زور دیتا ہے اس طرح اجتماعی زندگی کے لیے بھی اصول وضع کرتا ہے۔

---

1 - الشوری: ۱۳

کسی قوم کے لیے ریاست کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی خاندان کے لیے گھر، و قوموں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظریات مل کر ایک نظامِ حیات ترتیب دیتے ہیں۔ ریاست ایک ایسا اجتماعی ادارہ ہوتا ہے جو اس کو چلاتا ہے۔

تاریخ نے ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، انبیاء کرام، اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی کوشش کرنے کی جد و جہد کرتے رہے، قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرتِ یوسفؑ حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، اور نبی کریم ﷺ نے بھی باقاعدہ اسلامی ریاست قائم بھی کی اور اس کو معیاری شکل میں چلایا بھی۔

ماضی قریب کے دو مفکر مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد نے اسلامی ریاست کے حوالے سے کچھ آراء پیش کی ہیں۔ ان آراء کی روشنی میں جمہوری نظام کو کیسے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ اور بنیادی طور پر ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی آراء کی روشنی میں عصر حاضر میں اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو کے لیے کیا خدوخال ہو سکتے ہیں؟

مجموعی طور پر امت ریاست کے وقار اور کردار کے اعتبار سے مشکل دور سے گزر رہی ہے ایسے حالات میں ایسی بنیادوں کو واضح کرنا اشد ضروری ہے جو دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے صحیح اسلامی ریاست کا تصور پیش کریں۔ جس میں اسلام کی سربلندی ہو اور تمام مسائل کا حل موجود ہو اس اہمیت کے پیش نظر دونوں مفکرین کے نظریات کا تقابلی جائزہ لیا جائے گا تاکہ کامیابی اور ناکامی کے اسباب نمایاں ہو جائیں اور اسلامی ریاست کی تشکیل میں مددگار ہو۔

موضوع کی تحدید

اس مقالہ میں صرف مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے ریاست اسلامی کی تشکیل نو سے متعلق افکار کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اس مناسبت سے ان علماء کی تفاسیر اور متعلقہ کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مقاصد تحقیق

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودی کے ہاں اسلامی ریاست کے مقاصد کیا ہیں، ان کو تلاش کرنا۔

2۔ دونوں مفکرین کی آراء کی روشنی میں خلافت اور جمہوریت کے تصور کا تجزیہ کرنا۔

3۔ مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد نے اسلامی ریاست کی تشکیل کیلئے جن عوامل کا تذکرہ کیا ہے ان کا تقابل کرنا۔

4۔ دونوں مفکرین کی آراء کو سامنے رکھ کر عصر حاضر میں اقامت دین کیلئے کونسا لائحہ عمل اختیار کیا جا سکتا ہے اس کی تشکیلی صورت تلاش کرنا۔

بنیادی سوالات

1۔ اسلامی ریاست کے مقاصد اور خصوصیات کیا ہو سکتی ہیں؟

2۔ڈاکٹر اسرار احمد کا خلافت اور مولانا مودودی کا جمہوری نظام کو ترجیح دینے کی وجوہات کیا ہیں؟

3۔مولانا مودودی نے اسلامی ریاست کی تشکیل کے لیے کون سے عوامل کا تذکرہ کیا ہے؟

4۔عصر حاضر میں اقامت دین کے لیے کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جا سکتا ہے؟

ماقبل موضوع پر تحقیق

موضوع پے اس سے قبل ان موضوعات پر مقالاجات لکھے جا چکے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

1۔سید مودودی اور اس کے سیاسی افکار، فرید احمد پراچہ، یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، سن تکمیل 2003ء۔

2۔سید ابو اعلی مودودی، بیسویں صدی کے مسلمان مفکر، فرزانہ سلیمان، کراچی یونیورسٹی، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، سن تکمیل:1999ء

3۔مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی شخصیت اور تحریک ایک معروضی مطالعہ، فریدہ خانم جامعہ نگر نئی دہلی، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، سن تکمیل:1991ء

4۔ڈاکٹر اسرار احمد کی مذہبی سیاسی فکر کا تجزیاتی مطالعہ، سمیرا ربیعہ، گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ پنجاب پاکستان، مقالہ برائے ایم فل، سن تکمیل:2016ء۔

5۔عصر حاضر میں اسلامی ریاست کی تشکیل (تحقیقی جائزہ مسلم مفکرین کی افکار کی روشنی میں)، فرید الدین طارق، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (علوم اسلامیہ)، سن تکمیل:2015ء۔

اسلوب تحقیق

زیر نظر مقالہ کے اسلوب تحقیق کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

1۔تجزیاتی اسلوبِ تحقیق اختیار کیا گیا ہے۔

2۔تقابلی اسلوبی تحقیق اختیار کیا گیا ہے۔

خاکہ تحقیق

اس تحقیق مقالہ کو مقدمہ، چار ابواب، نتائج مقالہ، فہرست آیات و احادیث، فہرست مصادر و مراجع میں تقسیم کیے گیے ہیں۔

باب اول

مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار کا تصور اسلامی ریاست

فصل اول: مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کا تعارف

فصل دوم: اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد اور اس کی بنیادی خصوصیات

فصل سوم: مسلمان ممالک میں روبہ عمل سیاسی نظام

فصل اول

مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کا تعارف

سید ابو الاعلیٰ مودودی کا تعارف و خدمات

سید ابو الاعلیٰ مودودی 25 ستمبر 1903ء کو مہاراشٹر کے ایک شہر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اکتالیسویں پشت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے[1]۔ ان کے والد کا نام سید احمد حسن تھا جو 1857ء کے ہنگامے سے دو سال قبل دہلی میں پیدا ہوئے اور بعد میں سر سید کے مدرسہ علی گڑھ کے اولین طلبہ میں شمار ہوئے اور ان کا پیشہ وکالت تھا۔

سید مودودی کی پیدائش سے قبل ہی سید احمد کا رجحان دین کی طرف ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے فرزند کے لیے فارسی، عربی، تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم کا پورا انتظام کیا[2]۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس کے بعد ان کو مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد کے جماعت رشیدیہ (آٹھویں جماعت) میں داخل کروادیا گیا۔ اپنے ہم جماعتوں میں عمر کے اعتبار سے کم سن ہونے کے باوجود پڑھائی کے اعتبار سے وہ ان سب سے زیادہ ذہین واقع ہوئے تھے[3]۔

1914ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا[4]۔ دار العلوم حیدر آباد کی جماعت "مولوی عالم" میں داخل ہوئے۔ یہاں مولانا حمید الدین فراہی صدر مدرس تھے۔ چھ ماہ تک سید مودودی نے حیدر آباد میں تعلیم حاصل کی لیکن والد پر فالج کے حملے نے ان کو واپس بھوپال جانے پر مجبور کر دیا[5]۔

مولانا اس عہد کے بارے میں بتاتے ہیں کہ "میں سولہ یا سترہ برس کی عمر میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہوا اور اس کے بعد میں نے آوارہ خوانی شروع کر دی۔ جو ملا پڑھ ڈالا۔ اس آوارہ خوانی کا نہایت خطرناک نتیجہ بر آمد ہوا اور مذہب سے میرا ایمان و یقین ختم ہو گیا[6]۔

1۔ اسعد گیلانی، سید مودودی، دعوت و تحریک، (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 1986ء)، ص: 55 تا 58

2۔ ایضاً، ص: 26، 27

3۔ چوہدری عبد الرحمان، مفکر اسلام سید ابو الاعلیٰ مودودی (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 1988ء)، ص: 51

4۔ ڈاکٹر سفیر اختر کے مطابق سید مودودی نے مولوی کا امتحان 1335ھ میں دیا تھا اور نتیجے کا اعلان 1336ھ میں ہوا تھا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ادب اور ادیب، سید مودودی کی نظر میں، دار المعارف، لاہور)

5۔ محمد یوسف، مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، (البدر پبلی کیشنز، لاہور، 1955ء)، ص: 42، 41

6۔ خرم بدر، سید مودودی کی سیاسی زندگی، (صبا پبلی کیشنز، کراچی، 1988ء)، ص: 96

اس وقت میں عربی زبان پر عبور حاصل کر چکا تھا، چنانچہ میں نے قرآن اور حدیث کا براہ راست مطالعہ کرنا شرع کر دیا جس سے حقوق و معارف کھلتے چلے گئے اور بے یقینی کا غبار ڈھلتا چلا گیا۔ میں نے دیگر ادیان کی کتب کا مطالعہ کیا جس سے مجھے یک گونہ اطمینان حاصل ہوا اور میں نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کر لیا۔ اس مرتبہ قبولیت اسلام کے حوالے سے مجھے حقانیت اسلام پر پورا یقین تھا[1]۔ ان کے والد سید احمد حسن 1920 میں فوت ہوئے[2]۔

سید مودودی نے قیامِ دہلی کے دوران اپنی تعلیم مکمل کر لی اور 1926 میں دار العلوم مسجد فتح پوری، دہلی کے مدرس مولانا شریف اللہ خان سے علوم متداولہ کی تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ 1927 میں فتح پور کے مدرس عالیہ مولانا اشفاق الرحمان کاندھلوی سے حدیث، فقہ اور عربی کی سند حاصل کی[3]۔ مولانا عبد السلام نیازی چشتی دہلوی سے فلسفہ پڑھا[4]۔

1937ء میں مولانا مودودی ی شادی دہلی کے ایک متمول خاندان میں ہوئی۔ کچھ عرصے بعد آپ علامہ اقبال کی تجویز پر پٹھان کوٹ کے گاؤں جمال پور میں مقیم ہو گئے[5] چونکہ چوہدری نیاز نامی ایک جاگیر دار نے علامہ اقبال کی ترغیب پر وہاں ساٹھ ایکڑ زمین وقف کر رکھی تھی تاکہ اس پر ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جاسکے جو آسان اور جدید علوم کی تعلیم و ترویج میں مفید ثابت ہو سکے۔ ادارہ قائم ہو گیا اور مولانا مودودی نے اس میں خدمات بھی سر انجام دیں لیکن محض ڈھائی تین ماہ بعد چوہدری نیاز کے ساتھ اختلافات کے باعث ان کو پٹھان کوٹ سے لاہور آنا پڑا اور پھر یہاں کے تعلیمی اداروں میں لیکچرز کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کیا[6]۔

بطور سیاسی کارکن سید مودودی نے جنگ عظیم اول کے بعد برصغیر میں انگریزوں کے تسلط کے خلاف مزاحمت شروع ہوئی تو سید مودودی نے بھی "انجمن اعانت بندان[7]" میں شمولیت اختیار کی[8]۔ سید مودودی نے اس جماعت منہج کا واضح نہ ہونا محسوس کیا اور اس سے کچھ عرصہ بعد الگ ہوئے[9]۔

1۔ خرم بدر، سید مودودی کی سیاسی زندگی، ص:97

2۔ خالد سلیم منصور، وثائقِ مودودی، (ادارہ معارف اسلامی، لاہور)، ص:97

3۔ پروفیسر سید محمد سلیم، مولانا مودودی کا مذہب عالم کا مطالعہ، ماہنامہ افکارِ معلم (نومبر 1996ء) ص:20

4۔ صوفیہ فرناز، مولانا مودودی کی تعلیمی اسناد، مشمولہ "سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تاریخ نویسی کا فنی و تجزیاتی مطالعہ، غیر مطبوعہ پی ایچ ڈی مقالہ، شعبہ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی (2010ء)

5۔ چودھری عبد الرحمٰن، مفکر اسلام سید ابو الاعلیٰ مودودی، ص:112

6۔ ایضاً، ص:149

7۔ یہ ایک خفیہ سیاسی جماعت تھی جو برصغیر میں سیاسی انقلاب لانا چاہتی تھی۔ اس جماعت میں مولانا حسرت موہانی، مولانا آزاد سبحانی اور مولانا عبد الباری فرنگی ایسے لوگ بھی شامل تھے۔

8۔ محمد یوسف، مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص:72

9۔ علی سفیان آفاقی، سید ابو الاعلیٰ مودودی، (لاہور، سندھ ساگر اکیڈمی 1958ء)، ص:64

سید مودودی نے 1941ء میں جماعت اسلامی قائم کی۔ آپ 1972ء تک اس کے سربراہ رہے[1]۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان منتقل ہوئے اور بدستور جماعت اسلامی کے سربراہ رہے[2]۔ نفاذِ شریعت کا مطالبہ آپ کی سیاسی جماعت نے زور وشور سے کیا جس کے باعث آپ کو کئی مرتبہ گرفتار بھی کیا گیا تھا[3]۔

اپنے والد کی وفات کے بعد سید مودودی نے صحافت کو بطور ذریعہ روزگار اپنایا اور بجنور سے جاری ہونے والے، اپنے بھائی ابوالخیر مودودی کے اخبار "مدینہ" میں کام کیا۔ جبل پور سے جاری ہونے والے ہفت روزہ "تاج" میں کام کیا لیکن اخبارات کے لیے حالات کی ناسازگاری کے باعث کچھ عرصہ بعد یہ کام ترک کر کے واپس بھوپال کا رخ کیا[4]۔

1921ء میں مولانا مودودی نے دہلی آکر جمیعت علماء ہند کے اخبار "مسلم" میں 1923ء تک بطور مدیر خدمات سرانجام دیں۔ بعد میں اسی تنظیم کے سہ روزہ اخبار: الجمیعۃ" سے منسلک رہے[5]۔

1932ء میں ماہنامہ ترجمان القرآن شروع کیا اور اس کی ادارت اپنے ہاتھ میں رکھی۔ اس کے تمام شمارے علامہ اقبال کو بھی بھجوائے جاتے تھے اور بصارت زائل ہو جانے کے زمانے میں وہ اس ماہنامے کے چیدہ چیدہ مقامات پڑھوا کر سنتے تھے[6]۔ مولانا کی کئی کتابیں اسی ماہنامہ میں شائع ہونے والے مقالات کے مجموعے ہیں۔ ان میں "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، تفہیمات، پردہ، تنقیحات، مسئلہ قومیت، تحریک آزادی ہند اور مسلمان شامل "ہیں[7]۔

1956ء تا 1974ء مولانا نے اسلامی دنیا کے متعدد ممالک کے دورے کیے۔ ان میں قاہرہ، دمشق، عمان، مکہ، مدینہ، جدہ، کویت، ارباط، استنبول، لندن، ٹورنٹو وغیرہ شامل ہیں۔ آپ نے تقریباً دس بین الاقوامی کانفرنسوں میں خطاب کیا اور 1959، 1960ء میں سعودی عرب، اردن، بشمول فلسطین، شام اور مصر کا بھی مطالعاتی دورہ کیا[8]۔

1961 میں شاہ سعود کی دعوت پر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ کے قیام کے موقع پر آپ اپنی مفصل تعلیمی اسکیم لے کر شاہی مہمان کی حیثیت سے گئے[9]۔

1۔ خالد سلیم منصور، وثائق مودودی، ص:96

2۔ پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری، احیائے اسلام اور مولانا مودودی، تذکرہ، ص:2/21

3۔ ایضاً

4۔ محمد یوسف، مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، ص:44

5۔ ایضاً، ص:46

6۔ چودھری عبدالرحمٰن، مفکر اسلام ابوالاعلیٰ مودودی، ص:123

7۔ ایضاً، ص:93

8۔ اسعد گیلانی، سید مودودی، دعوت و تحریک، ص:200

9۔ چودھری عبدالرحمٰن، مفکر اسلام ابوالاعلیٰ مودودی، ص:293

مذکورہ یونیورسٹی کے قیام سے لے کر آخری دم تک آپ اس کی اکیڈمک کونسل کے رکن رہے۔ آپ رابطہ عالم اسلامی کی تاسیسی کمیٹی اور اکادمی برائے تحقیق فقہ اسلامی مدینہ کے بھی رکن تھے[1]۔

1979 میں سید مودودی کو اعلیٰ اسلامی خدمات کے باعث سعودی عرب کی حکومت نے "شاہ فیصل ایوارڈ" سے نوازا[2]۔

1978ء میں آپ کی طبیعت سخت خراب ہوئی اور آپ 1979 میں بغرض علاج امریکہ چلے گئے۔ 23 ستمبر 1979 میں آپ وفات پا گئے۔

مولانا مودودی کی اہم کتب مندرجہ ذیل ہیں۔

- قرآن کی چار بنیادی اصطلاحات (1941ء)۔
- تفسیر تفہیم القرآن (1942 تا 1972ء)۔
- الجہاد فی الاسلام (1927ء)۔
- رسالات دینیات (1932ء)۔
- خطبات (1939ء)۔
- حقوق الزوجین (1936ء)۔
- سلامتی کا راستہ (1940ء)۔
- شہادت الحق (1941ء)۔
- اسلام اور جاہلیت (1941)۔
- دین حق (1943ء)۔
- قادیانی مسئلہ (1953ء)۔
- ختم نبوت (1962ء)۔
- ہمارے نظام تعلیم کے بنیادی نقائص (1936ء)۔
- نظام تعلیم کا خاکہ (1941ء)۔
- نئی تعلیمی پالیسی اور اس کا مسلمانوں کے لیے پروگرام (1942ء)۔
- الاسلام کا اخلاقی نقطہ نظر (1944ء)۔

1۔ احیائے دین اور مولانا مودودی، ص: 23

2. Sarwat Saulat, *Maulana Maududi*, International Islamic Publisher, Karachi (Nov 1979), P. 114

- تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں(1945ء)۔
- اسلامی تعلیم اور پاکستان میں اس کا نفاذ(1952ء)۔
- ایک اسلامی یونیورسٹی کا خاکہ(1960ء)۔
- تجدید احیاء دین(1940)۔
- انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل(1941)۔
- پردہ(1939)۔
- عہدِ جدید کی بیمار اقوام(1935)۔
- اسلام کا نظریہ سیاسی(1939ء)۔
- قومیت اور انڈیا(1939ء)۔
- مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش(1940)۔
- قوموں کا عروج وزوال(1947ء)۔
- ہمارا پیغام(1947ء)۔
- اسلام کا نظام حیات(1948ء)۔
- اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیتیں(1948)۔
- مسلمان دنیا کا اتحاد(1967ء)۔
- اسلام میں انسانی حقوق(1975ء)۔
- خلافت وملوکیت(1967ء)۔
- آج کا اسلام(1968)۔
- نبی اکرم ﷺ کا نظامِ حکومت(1978ء)۔
- اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کا تعارف(1948)۔
- اجتہاد کا کردار اور اسلام میں قانون سازی کی گنجائش(1960)۔
- اسلامی قانون اور آئین(1960)

ڈاکٹر اسرار احمد کا تعارف و خدمات

ڈاکٹر اسرار احمد 26 اپریل 1932 کو پیدا ہوئے[1]۔ 1947ء میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے حصار ہائی اسکول میں میٹرک کیا[2]۔ 12 جولائی 1947 کو پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں میں پاس کیا۔ انہوں نے کل 850 میں سے 718 نمبر لیے اور یونیورسٹی میں چوتھی[3] جب کہ ضلع حصار میں پہلی پوزیشن حاصل کی[4]۔

مولانا مودودی کے ترجمان القرآن اور دیگر رسائل و کتب کا مطالعہ بھی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے میٹرک کے دور میں شروع کیا اور جماعت اسلامی کے اس وقت تک شائع شدہ تمام رسائل و کتب کا مطالعہ کیا[5]۔ اور اس کی وجہ ان کے بڑے بھائی اظہار احمد تھے جنہوں نے انجینئرنگ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کی رکنیت بھی اختیار کر رکھی تھی[6]۔ اس رکنیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ میٹرک کے دوران ڈاکٹر اسرار احمدؒ احمد عملاً تحریک مسلم لیگ سے وابستہ ہونے کے باوجود جماعت اسلامی کے نظریات کے بھی حامی رہے اور مسلم لیگ یا مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے حلقوں میں جب بھی مولانا مودودی یا جماعت اسلامی پر کوئی تنقید ہوتی یا طنز و طعن کا معاملہ ہوتا تو ان کی جانب سے مدافعت میں پورا زور صرف کر دیتے[7]۔

لاہور آتے ہی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ شروع کر دیا اور ضلعی سطح پر جماعت کے حلقہ کرشن نگر میں عملاً شامل ہو گئے۔ اسی زمانے میں، یعنی 1948 کے اوائل میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا اور 1948 کے اواخر میں اس کی تکمیل ہوئی[8]۔ تحریک اور تعلیم ایک ساتھ چلنے لگی لیکن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے بقول تحریک کے ساتھ ان کا یہ تعلق سطحی تھا اور وہ اسے سمجھ نہیں پائے تھے۔ 1949 کے اواخر میں میڈیکل کالج میں داخل ہوئے تو جماعت کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا[9]۔

1۔ اداریہ، ہفت روزہ ندائے خلافت، لاہور، 27 اپریل تا 3 مئی 2010، ص 3

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، استحکام پاکستان، (لاہور: انجمن خدام القرآن) ص 23، 42

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، (لاہور: انجمن خدام القرآن) ص 11

4۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ، ہفت روزہ ندائے خلافت لاہور، ج 19، شمارہ 17، 27 اپریل تا 3 مئی 1010، ص 35

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، ص 19

6۔ ڈاکٹر اسرار احمد، حساب کم و بیش، (لاہور: انجمن خدام القرآن)، ص 20

جماعت کے امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ احمد پر دو چیزیں آشکار ہوئیں۔ ایک یہ کہ اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دین ہے اور یہ ایک مکمل نظام زندگی ہے اور یہ غلبہ چاہتا ہے، مغلوبیت نہیں۔ دوسری یہ کہ اسلام محض عبادات یعنی نماز و روزہ اور حج و زکاۃ ہی نہیں بلکہ اور بھی نہت کچھ ایک مسلمان کی زندگی میں دیکھنا چاہتا ہے (تنظیم اسلامی کی دعوت، ص: 6)۔

7۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک جماعت اسلامی، ایک تحقیقی مطالعہ، (لاہور: انجمن خدام القرآن)، ص 37، 37

8۔ ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام میں عورت کا مقام، (انجمن خدام القرآن، لاہور)، ص 133

9۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ، ص: 38

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے پیشہ ورانہ تعلیم کے علاوہ اسلام سے محبت اور علوم دینی سے شغف کی بدولت 1965 میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا اور جامعہ کراچی میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اس دوران مفتی محمد شفیع، مفتی رفیع عثمانی اور مفتی تقی عثمانی کی قربت بھی حاصل رہی[1]۔

اپنی زندگی کے شعوری دور کی ابتداء میں 1950 تا 1954 (لاہور میڈیکل کالج میں تعلیم کے دوران) تک اسلامی جمیعت طلبہ کے رکن رہے اور اس میں آپ نے ایک عام کارکن اور رکن سے لے کر اس کی نظامت عالیہ تک کے فرائض سرانجام دیے[2]۔

اکتوبر 1954 میں ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کر کے ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اسلامی جمیعت طلبہ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور زیادہ سے زیادہ ایک ماہ بعد 15 نومبر 1954 کو جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست دی[3]۔ فروری 1955 میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی درخواست منظور ہو گئی اور انہوں نے ایک متحرک اور فعال کارکن کی حیثیت سے اس میں کام کرنا شروع کر دیا[4]۔

چنانچہ وہ ساہیوال منتقل ہو گئے اور وہاں جماعت اسلامی کی ڈسپنسری میں ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ ہی عرصہ بعد انہیں جماعت اسلامی ضلع ساہیوال کا امیر بنا دیا گیا۔ یہی وہ دور تھا جب انہیں اپنی عملی زندگی میں قدم رکھنا تھا ،جس میں معاشی زندگی کی ابتدائی تھی۔ مزید یہ کہ انہیں معاشرتی بندھن میں بندھنا تھا مگر انہوں نے جماعت کی ذمہ داریوں اور ان دونوں ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی سرانجام دیا[5]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے جماعت میں اس کے نصب العین کے مطابق کام کرنے کے بعد جماعت کی موجودہ پالیسیوں سے اختلاف کیا۔ اسی دوران جماعت کے اندر بھی اس کی پالیسی کے بارے میں بے اطمینانی بڑھنی شروع ہو گئی جس کے لیے ایک جائزہ کمیٹی بنائی گئی۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اواخر 1956 میں اپنا ایک مفصل بیان قلم بند کر کے جائزہ کمیٹی کے سپرد کر دیا[6]۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے جماعت اسلامی کی ڈسپنسری سے بھی استعفیٰ دے دیا اور ساہیوال میں اپنا ذاتی مطب کھول لیا۔ اسی دوران تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی دو سال رابطہ رکھا اور شب جمعہ کے بیان میں شرکت بھی کرتے۔ فجر

1۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے حالات زندگی اور خدمات، ماہنامہ میثاق، لاہور، جلد 59، شمارہ 5، مئی 2010، ص 81

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، ص 19

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ، ص 43

4۔ ایضاً، ص 44،45

5۔ ایضاً، ص 44

6۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تاریخ جماعت اسلامی ایک گم شدہ باب (مرکزی انجمن خدم القرآن)، ص 157

کے بعد تبلیغی جماعت کے اجتماع میں درس بھی دیتے رہے۔ بعد میں انہیں محسوس ہوا کہ تبلیغی جماعت کی اصل توجہ افراد کی اصلاح پر ہے۔ وہ اقامت دین کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل پیش کرنے کے لیے تیار نہیں ہے لہٰذا ان کا تبلیغی جماعت سے مزید رابطہ جاری نہ رہ سکا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے 1954 تا 1957 تین سال جماعت اسلامی ساہیوال کی ڈسپنسری میں ملازمت کی اور پھر 1957 تا 1962 اپنی ذاتی پریکٹس کی[1]۔ 1957 میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنا مطب بند کیا اور اہل و عیال سمیت کراچی منتقل ہو گئے لیکن وہاں سے والد صاحب کی علالت کی وجہ سے چھ یا سات ماہ بعد دوبارہ ساہیوال لوٹ آئے[2]۔ 11 نومبر 1965 کو ان کے والد انتقال فرما گئے۔

26 فروری 1955 کو ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی شادی ہوئی۔ ان کی اہلیہ طاہرہ بیگم ایک دین دار خاتون ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد آپ کی اہلیہ کا خاندان ضلع گورداسپور سے ساہیوال آکر قیام پذیر ہو گیا۔ یہاں انہوں نے مدرسۃ البنات سے مولوی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ بچپن کے دینی رجحانات کی وجہ سے ساہیوال آکر جماعت اسلامی کی رکن بن گئیں اور یوں وہ ڈاکٹر موصوف کی والدہ محترمہ فردوسی بیگم کے قریب ہو گئیں۔ ان کی یہی سادگی فردوسی بیگم کو پسند آئی اور انہیں اپنی بہو بنالیا[3]۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے 1962 سے 1965 تک تین سال اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر ایک کاروباری اشتراک میں کراچی میں گزارے[4] لیکن وہ اشتراک نہ چل سکا اور جب علیحدگی ہوئی تو کچھ تلخیاں بھی پیدا ہو گئیں جن کے اثرات کافی دیر تک چلتے رہے[5]۔ آپ کراچی سے 1965 میں واپس ساہیوال آ گئے[6]۔ اب از سر نو ساہیوال

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، حساب کم و بیش، ص8

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، ص28

3۔ ملاقات، بیگم ڈاکٹر اسرار احمدؒ

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، حساب کم و بیش، ص9

5۔ ایضاً، ص84

6۔ اس کی تفصیل انجینئر نوید قمر یوں لکھتے ہیں کہ "1962 میں ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی اظہار احمد کو اپنی تعمیراتی کمپنی قریشی کنسٹرکشن میں ان کی معاونت درکار ہوئی۔ اس کمپنی میں ڈاکٹر اسرار کے چھوٹے بھائی بھی حصہ دار تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ ان کی تجویز پر کراچی گئے اور اس کمپنی میں بطور جنرل مینجر کام کرنا شروع کیا۔ اس دوران ان کی رہائش کچھ عرصہ کے لیے کورنگی ٹاؤن میں دارالعلوم کراچی کے بالکل ساتھ اظہار لمیٹڈ فیکٹری میں رہی۔ اسی دوران کچھ عرصہ انہوں نے ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی صاحب کے ساتھ بھی کام کیا جو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو چکے تھے البتہ ان کے مزاج میں بعض دینی تصورات بالخصوص توحید کے ضمن میں حد سے بڑی ہوئی شدت کہ جس کے باعث بعض جلیل القدر اکابر بھی امت میں ہونے کے باوجود بھی مشرک قرار پائے، ڈاکٹر اسرار کا ان کے ساتھ اشتراک عمل زیادہ دیر نہ رہ سکا۔ 1965 میں قریشی کنسٹرکشن کمپنی کو مالی مشکلات کی بنا پر بینک سے سودی قرض لینا پڑا جس پر ڈاکٹر اسرار نے احتجاج کیا اور کمپنی سے قطع تعلقی کر کے والدین سمیت واپس ساہیوال آ گئے۔ (ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیم اسلامی، ص: 23، شعبہ مطبوعات انجمن خدام القرآن، کراچی، 2011ء)

میں پریکٹس شروع کرنے میں حجاب محسوس ہوا۔ طبیعت کے دینی رجحان کی وجہ سے یا بامقصد زندگی کے اعتبار سے لاہور ہی میں کسی کام کا آغاز مناسب سمجھا اور اسی غرض سے لاہور چلے آئے[1]۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی جمع پونجی سے کرشن نگر میں ایک مکان خریدا اور اس مکان میں اپنا مطب قائم کیا۔ مکان کی بالائی منزل پر اپنی رہائش اختیار کی۔ 1965 تک کے دور کو ڈاکٹر اسرار احمدؒ اپنی زندگی کا شدید ترین مشقت بھرا دور قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس دور میں مندرجہ ذیل کام ایک ساتھ شروع کر دیے۔ (1) اپنا ذاتی مطب اور اس میں کاروبارِ روزگار کے لیے مریضوں کا علاج۔ (2) لاہور کے مختلف گوشوں میں مطالعہ قرآن کے لیے حلقوں کا قیام۔ (3) تحریر و تسوید اور دار الاشاعت کا انتظام

اسی وجہ سے 1970 تک ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی صحت نے بالکل جواب دے دیا اور دوسری جانب ابتدائی فارغ البالی کے کچھ عرصے میں مالی مشکلات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ 1970 کے انتخابات کے حوالے سے جمیعت علماء اسلام کی قیادت نے انہیں اپنے ٹکٹ پر صوبائی الیکشن لڑنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ اس دور میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے سیاست سے بچنے اور اپنی زندگی کا آئندہ لائحہ عمل طے کرنے کے لیے حرمین شریفین کا قصد کیا[2]۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ اواخر اکتوبر 1970 میں عازم حج ہوئے۔ یہ سفر 120 دنوں پر محیط رہا جو ان کی زندگی کا طویل ترین سفر تھا اور ہر اعتبار سے اہم بھی۔ اس لیے کہ اس سفر کے دوران انہوں نے حج کے موقع پر اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کیا، یعنی میڈیکل پریکٹس کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہا اور جملہ صلاحیتوں، توانائیوں اور کل اوقات کو دعوت قرآن اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ[3]"۔ چنانچہ 1971 میں حجاز سے واپسی پر مطب کا سلسلہ بالکل بند کر دیا اور بقیہ عمر اللہ کی کتاب اور دین کے کاموں میں لگانے کا آغاز کیا[4]۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے دعوتی دور کا عملاً آغاز تو اٹھارہ برس کی عمر میں 1950 میں ہی ہو گیا تھا تاہم آزادانہ حیثیت میں دعوت دین اور خدمت قرآن کا سلسلہ 1965 سے شروع ہوا۔ ان کی دعوت کے دو ادوار ہیں۔

1965 سے 1972 تک انفرادی کوشش کا دور ہے جس کے دوران وہ دعوتِ حق دروس قرآن کی شکل میں لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ اس دور میں ڈاکٹر اسرار احمد نے چار اہم کام کیے۔

- لاہور کے حلقہ ہائے مطالعہ قرآن میں دروس کا انعقاد۔
- مطالعہ قرآن کی سورتوں کے منتخب نصاب کو کتابی شکل میں یکجا کرنا۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، ص30،20

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، حساب کم و بیش، ص38 تا40

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، ص40

4۔ ایضاً، ص43

- 1966ء میں خالص نجی اشاعتی ادارے کا قیام دار الاشاعت نام سے کیا۔
- 1966ء میں ماہنامہ میثاق کا اجرا[1]۔

دوسرا دور 1972ء سے شروع ہوا اور تاحیات جاری رہا۔ اس دور میں ڈاکٹر اسرار احمد نے 14 اہم کام کیے۔

- 1972ء میں انجمن خدام القرآن کا قیام۔
- 1975ء میں تنظیم اسلامی کا قیام[2]۔
- 1976ء میں قرآن اکیڈمی کا قیام[3]۔
- 1979ء میں امریکہ کا سفر بغرضِ تبلیغ۔
- 1981ء میں صدر ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں شمولیت اور استعفیٰ[4]۔
- 1982ء میں قرآن اکیڈمی فیلوشپ اسکیم کا آغاز۔
- 1984ء میں تدریسی اسکیم کا آغاز۔
- 1987ء میں قرآن کالج کا قیام[5]۔
- 1987ء میں شریعت بل کی منظوری کے خلاف دینی جماعتوں کے اتحاد کی معاونت۔
- 1991ء میں تحریک خلافت کا قیام۔
- 1997ء میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی مہم۔
- 1998ء میں دورہ ترجمہ قرآن کی ریکارڈنگ اور QTV اور دیگر ٹی وی چینلوں کے ذریعے اسکی نشرواشاعت۔
- 2002ء میں تنظیم اسلامی کی امارت سے سبکدوشی۔
- 2004ء اور 2005ء میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کی دعوت پر بھارت کا دورہ اور خطابات۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر، (مرکزی انجمن خدام القرآن)، ص160 تا170

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تنظیم اسلامی کی دعوت، ص7

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر، ص23 تا28

4۔ تنظیم اسلامی کی دعوت، ص:9، صدر ضیاء الحق ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے درس قرآن میں شریک ہوتے رہے تھے اس لیے انہوں نے ابتداء میں ڈاکٹر اسرار کے لیے بھی پذیرائی کا خاص اہتمام کیا۔ کئی مقامات پر اعلیٰ فوجی افسران کے سامنے ڈاکٹر صاحب کو سیرت کے موضوع پر خطاب کے مواقع بھی فراہم کیے۔ مجلس شوریٰ میں ڈھائی ماہ گزار کر ڈاکٹر اسرار کو اندازہ ہو گیا کہ شوریٰ کا ادارہ صرف خانہ پوری کے لیے ہے تاکہ عالمی برادری کو یہ تاثر دیا جاسکے کہ جنرل ضیاء الحق آمریت کے تحت نہیں بلکہ مشاورت کے تحت حکومت کا نظام چلا رہے ہیں۔ (دیکھیے انجینئر نوید احمد کا مضمون۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ، میثاق، اکتوبر 2011)

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر، (مرکزی انجمن خدام القرآن)، ص23

ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا انتقال 13 اپریل 2010 کی درمیانی شب میں ہوا[1]۔ وفات سے قبل انہوں نے اپنے ذاتی نام پر املاک کو دین حق ٹرسٹ کے نام منتقل کر دیا تاکہ ان کے بعد ورثاء ان کی حق ملکیت پر کسی تنازعہ کا شکار نہ ہو سکیں۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی نماز جنازہ 14 اپریل 2010 بروز بدھ بعد از نماز عصر سنٹرل پارک ماڈل ٹاؤن میں ان کے صاحبزادے امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید نے پڑھائی[2]۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی تصانیف اصل میں ان کے لیکچرز اور دروس کی تحریری صورت میں پیش کی گئی ہیں۔ اس لیے ان کی حیثیت مختلف کتابچوں کی سی ہے[3]۔

1۔ ماہنامہ میثاق، جلد 59، شمارہ 5، مئی 2010، ص 177

2۔ ہفت روزہ ندائے خلافت، جلد 19، شمارہ 17، 17 تا 27 اپریل تا 3 مئی 2010

3۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق۔ عظمت قرآن بزبان قرآن وصاحب قرآن۔ دنیا کی عظیم ترین نعمت قرآنِ حکیم۔ قرآن حکیم کی قوت تسخیر۔ راہ نجات سورۃ العصر کی روشنی میں۔ قرآن اور امن عالم۔ انفرادی نجات اور اجتماعی فلاح کے لیے قرآن کا لائحہ عمل۔ جہاد بالقرآن اور اس کے پانچ محاذ۔ قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ۔ تعارف قرآن مع عظمت قرآن۔ قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں۔ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب۔ بیان القرآن۔ راہ نجات۔ نیکی کی حقیقت۔ حکمت قرآنی کی اساسات۔ حظ عظیم۔ قرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کی اساس کامل۔ عقل۔ فطرت اور ایمان۔ نور ایمان کے اجزائے ترکیبی: نور فطرت اور نورِ وحی۔ ایمان اور اس کے ثمرات ومضمرات۔ اثباتِ آخرت کے لیے قرآن کا استدلال۔ تعمیر سیرت کی اساسات۔ بندہ مومن کی شخصیات کے خدوخال۔ عائلی زندگی کے بنیادی اصول۔ اسلام کا معاشرتی وسماجی نظام۔ مسلمانوں کی سیاسی وملی زندگی کے رہنما اصول۔ تواصی بالحق کا ذروۃ السنام، جہاد وقتال فی سبیل اللہ۔ جہاد کی غایت اولیٰ، شہادت علی الناس۔ نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت اور اس کے حصول کی راہ۔ انقلاب نبوی کا اساسی منہاج۔ جہاد سے گریز کی سزا: نفاق۔ صبر ومصابرت۔ سیرت طیبہ میں صبر ومصابرت کے مختلف ادوار۔ مدنی دور کے آغاز میں اہل ایمان کو پیشگی تنبیہ۔ نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں قتال فی سبیل اللہ کا آغاز۔ فتح ونصرت کا نقطہ آغاز: صلح حدیبیہ۔ ام المسبحات: سورۃ الحدید۔ رسول کامل ﷺ۔ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں۔ اسوہ رسول ﷺ۔ معراج النبی ﷺ۔ شہید مظلوم۔ سانحہ کربلا۔ مثیل عیسیٰ علیہ السلام، علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ۔ عظمت مصطفیٰ ﷺ۔ اربعین نووی۔ توحید عملی وغیرہ۔۔۔

فصل دوم

اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد اور اس کی بنیادی خصوصیات

ریاست کی تعریف

سیاسیات کے ماہرین کے مطابق ریاست کی وضاحت کے لیے لازم ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نقطہ ہائے نظر کا بھرپور لحاظ رکھا جائے کیونکہ دیگر اداروں کی مانند ریاست بھی معاشرتی و سیاسی امور کو نمٹانے والا ایک ادارہ ہی ہے۔ سماجی علوم کے دائرہ معارف میں اسی تناظر میں ریاست کی تعریف یہ لکھی گئی ہے کہ "

"ریاست مشترکہ مقاصد کے لیے اجتماعی صورت میں کام کرنے والا انسانی گروہ ہے[1]"۔

ابن خلدون کے تصور ریاست کے بارے میں ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"ابن خلدون نے شریعت کی بنیاد پر قائم شدہ ریاست (سیاستِ دینیہ) اور عقل کی بنیاد پر قائم شدہ ریاست (سیاست عقلیہ) کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا ہے اس کا نظریہ تاریخ زیادہ تر "عصبیت" کے تصور پر استوار ہے۔ عصبیت کا مطلب ہے، ایک گروہ یا خاندان کا دعویٰ حکمرانی، اجتماعی کارناموں اور فتوحات کی وجہ سے حاصل شدہ شہرت، عزمِ صمیم اور زبردست طاقت کی اساس پر ابن خلدون کے نظریے کے مطابق جب تک ایک گروپ (مثلاً قبیلہ قریش) یا خاندان (مثلاً سلجوق) اپنی کمزوری اور زوال کے آثار ظاہر نہیں کرتا، اس وقت تک وہ ریاست کے اوپر اپنا اقتدار برقرار رکھتا ہے۔ اور جب ایک گروپ یا خاندان اقتدار کھو دیتا ہے تو دوسرا گروپ یا خاندان تازہ "عصبیت" کے ساتھ اقتدار سنبھال لیتا ہے۔ ابن خلدون کے وقتوں میں بیشتر موجود مسلم ریاستیں مقتدر ریاستیں تھیں یعنی وہ طاقت کے بل پر اقتدار میں آئی تھیں۔ اس کی اپنی اصطلاح میں یہ ریاستیں "انسان کے خود ساختہ قوانین پر" قائم ہوئی تھیں۔ اس کا طرز استدلال یہ تھا کہ رسول کریمؐ قانون ساز امام تھے۔ آپؐ نے مسلمانوں کو شریعت کے تحت متحد و منظم کر دیا تھا، جس کی بالادستی کو خلفائے راشدینؓ کے پوری عہدِ خلافت میں تسلیم کیا جاتا رہا تھا۔ بعد ازاں مذہبی جوش و تحریک میں کمی آنے کی وجہ سے خلافت ملوکیت میں بدل گئی، جس میں حکمرانی انسانی عقل کے وضع کردہ قوانین کے تحت کی جاتی تھی، حالانکہ دعویٰ یہ کیا جاتا تھا کہ ان کا اصل سرچشمہ شریعت ہے۔"[2]

فارابی کے مطابق ریاست دو قسم کی ہے۔ اس کے بقول:

> "ریاست کی پہلی قسم ریاستِ فاضلہ کہلاتی ہے۔ اس میں حقیقی سعادت کے حصول کو ممکن بنانے والے امور کو فروغ دیا جاتا ہے۔ ایسی ریاست کے عوام اپنے حکمرانوں کے تابع اور وفادار ہوتے ہیں جن کی بدولت اقوام اور معاشرے بہترین صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ ریاست کی دوسری قسم ریاست جاہلیہ کہلاتی ہے۔ اس ریاست میں وہمی اور خیالی مسرت کا ذریعہ بننے والے افعال و عادات کی ترویج ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ان میں مسرت آمیز ماحول موجود نہیں ہوتا ہے[3]۔"

لفظ ریاست مسلمانوں میں شاہ ولی اللہ کے ہاں اہل مدینہ کے طور پر مستعمل ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ:

---

1. Encyclopedia of Social Sciences, New York, Vol. 22, p: 222

2 -اقبال، جاوید، "ابن سینا اور ابن خلدون کا نظریہ ریاست"، روزنامہ "دنیا" 22 نومبر 2017ء

https://dunya.com.pk/index.php/special-feature/2017-11-22/20122

3۔ ابو نصر محمد بن محمد بن ترخان بن اوزلغ فارابی، آراء اہل المدینہ الفاضلۃ، (مصر: المطبع السعادہ، 1906ء)، ص 26

"عامۃ الناس کی ایسی جماعت ایک تمدنی نظام کی پیروی اور پابندی کے تحت اجتماعی صورت میں زندگی گزار رہی ہو، اہلِ مدینہ کہلاتی ہے۔ لوگوں کی ایسی جماعت خواہ الگ الگ شہروں میں بس رہی ہو، اس کو اجتماعی گروہ ہی سمجھا جائے گا[1]"۔

ریاست کے بارے میں علامہ محمد اقبالؒ کا تصور۔

علامہ اقبال کا تصورِ ریاست اسلامی عصری تقاضوں کے مطابق قرآنی تصورِ ریاست ہے جو اقبال کی اُردو اور فارسی شاعری میں پوری آن بان کے ساتھ موجود ہے۔ اس حوالے سے ان کے مضامین اور علمی خطبے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ 1908ء میں علامہ اقبال نے اس حوالے سے لندن میں بھی خطاب فرمایا۔ یہ خطاب انگلستان کے سہ ماہی مجلے سوشیولوجیکل ریویو کے جولائی 1908ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ریاستِ اسلامی کی تعریف و تشریح کے لئے انھوں نے متعدد مضامین تحریر فرمائے۔ ان کا ایک بہت اہم مضمون ہندوستان ریویو کی دو اشاعتوں کی زینت بنا جس کا عنوان تھا "اسلام بطور ایک اخلاقی اور سیاسی تصورِ حیات" جس میں اسلامی معاشرے کی اہم تر خصوصیات بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کے اخلاقی و سیاسی نظامِ زندگی کو موضوع بنایا گیا تھا۔ اسی طرح 1910ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں "امتِ مسلمہ، ایک عمرانی مطالعہ" کے عنوان سے بہت اہم خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کی ترجمانی کی گئی۔ جس کا نمایاں پہلو ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ علامہ اقبال کے اس نوعیت کے مضامین، خطبات اور مکاتیب کا سلسلہ جاری رہا اور پھر الٰہ آباد میں اپنی زیرِ صدارت مسلم لیگ کے سالانہ جلسے میں واضح طور پر مسلمانوں کے لئے ایک نئی اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ پیش کر دیا۔ آپ نے اسلامی ریاست کا تصور ان الفاظ میں پیش کیا۔

"برصغیر میں ایک اسلامی ریاست کا قیام اس خطے اور اسلام دونوں کے مفاد میں ہو گا۔ میں یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی ایک مربوط ریاست قائم کی جائے۔"[2]

سید ابو الاعلیٰ مودودی نے ریاست کے قدیم و جدید تصورات کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"ریاست وہ ہیئتِ سیاسی ہے جس کے ذریعے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں[3]"۔

ان تمام تعریفات میں مشترک عناصر عوام، حکمران، نظریہ، مقصد، نصب العین اور اقدار ہیں۔ ان تمام چیزوں کا باہم مل کر ریاست کی تشکیل میں اساسی کردار ہے۔

1۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، (بیروت: دار الجیل، 1426ھ)، 1/44

2 ہاشمی، منور، "اقبال اور نظریہ پاکستان"، مجلہ "ہلال اردو"
https://www.hilal.gov.pk/urdu-article/detail/NDY1NA==.html

3۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 2000ء)، ص 17

اسلامی ریاست کے قیام کے انتظامی مقاصد

ابتدائی طور پر اس حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام اور دیگر ادیان کے مابین بنیادی فرق عقیدہ توحید کا ہے۔ یہی فرق اس کے سیاسی نظام میں نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کا اولین مقصد اللہ تعالیٰ کے اقتدار اعلیٰ کو نظریاتی اور عملی طور پر تسلیم کیا جائے۔ قرآن مجید اس کی طرف کل امت کی بھرپور رہنمائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ

﴿إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾[1]

ترجمہ: بے شک تمھارا رب اللہ ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا، رات کو دن پر اوڑھا دیتا ہے، جو تیز چلتا ہوا اس کے پیچھے چلا آتا ہے اور سورج اور چاند اور ستارے (پیدا کیے) اس حال میں کہ اس کے حکم سے تابع کیے ہوئے ہیں، سن لو! پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کا کام ہے، بہت برکت والا ہے اللہ جو سارے جہانوں کا رب ہے۔

سید مودودی کے مطابق اقتدار اعلیٰ سے مراد حاکمیتِ الٰہی کو زندگی کے ہر شعبے میں تسلیم کر لینا ہے[2]۔ اس کے علاوہ اپنی کتاب خلافت و ملوکیت میں سید مودودی نے واضح کیا ہے کہ انسانوں پر انسانوں کی حاکمیت نہیں بلکہ انسانوں کے خالق کی حاکمیت ہونی چاہیے۔ ان کے نزدیک "الالہ الخلق والامر" کا یہی مفہوم ہے۔

سید مودودی سے قبل یہی موقف ابو الحسن الماوردی[3]، امام غزالی[4]، امام ابن تیمیہ[5]، علامہ اقبال[6]، سید قطب[7] وغیرہ نے بھی پیش کیا ہے۔

اسلامی نظریاتی قانون کا نفاذ

دیگر سیاسی نظریات کی طرح اسلام کا سیاسی نظام محض لوگوں کے اکٹھا رہنے اور مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے تگ و دو کرنے تک محدود نہیں ہے۔ یہاں انسانی زندگی کو الٰہی تعلیمات سے ہمکنار کرنے کے لیے ایسا ضابطہ

1۔ الاعراف:54

2۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 1992)، ص9

3۔ الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب بصری الماوردی، الاحکام السلطانیۃ، (لاہور: قانونی کتب خانہ، 2015ء)، ص2

4۔ غزالی، محمد بن محمد بن محمد الغزالی، التبر المسبوک فی نصیحۃ الملوک، (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، 1988ء)، ص8

5۔ ابن تیمیۃ، احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام ابن تیمیۃ، السیاسۃ الشرعیۃ، (دار العلم الفوائد للنشر والتوزیع)، ص3

6۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید، (بزم اقبال، لاہور)، ص191-191

7۔ سید قطب، العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، (بیروت: دار الشرق، 1975ء)، ص542

ہائے عمل کی طرف رہنمائی دی گئی ہے جن کی روشنی میں لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ جب ریاست میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کی تسلیم کرلی جائے تو پھر دستور اور قانون بھی اسی کا نازل کردہ نافذ کیا جائے گا۔ قرآن مجید میں اللہ کا فرمان ہے کہ:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾[1]

ترجمہ: وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھے کام کا حکم دیں گے اور برے کام سے روکیں گے، اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں عبادات کا نظم قائم کرنا حکمران کی ذمہ داری ہے۔

حافظ عبد السلام بن محمد لکھتے ہیں کہ:

> "تاریخ شاہد ہے کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور خلفائے راشدین کے عہد میں اقامت صلوۃ کا ایسا مضبوط نظام قائم تھا کہ حدیث وسیرت اور تاریخ کی کتابوں میں دوسرے گناہوں کے ارتکاب کا اور ان کی سزا کا ذکر آپ پڑھیں گے مگر ایک بھی شخص نہیں پائیں گے جو نماز نہ پڑھتا ہو یا زکوٰۃ نہ دیتا ہو اور اسے مسلمان سمجھا جاتا ہو، حتیٰ کہ منافقین کو بھی اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دینے کے لیے مسجدوں میں آکر نماز پڑھنا پڑتی تھی[2]"۔

اقتدار اور بادشاہت عطا کرنے کا اختیار محض اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہ جس کو چاہے بادشاہت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہے حکمرانی چھین لیتا ہے۔ یہی حقیقت ایک اور مقام پر بیان کی گئی ہے:

﴿قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[3]

ترجمہ: کہہ دے اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔ سید مودودی اس کی تشریح میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے کمالِ قدرت کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "یعنی یہ فیصلہ کہ زمین کا انتظام کس وقت کسے سونپا جائے دراصل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مغرور بندے اس غلط فہمی میں ہیں کہ زمین اور اس کے بسنے والوں کی قسمتوں کے فیصلے کرنے والے وہ خود ہیں۔ مگر جو طاقت ایک ذرا سے بیج کو تناور درخت بنا دیتی ہے اور ایک تناور درخت کو بیزم سوختنی میں تبدیل کر دیتی ہے، اسی کو یہ قدرت

1۔ الحج:41

2۔ حافظ عبد السلام، تفسیر القرآن الکریم، (دار الاندلس، لاہور)، 2/831

3۔ آل عمران:26

حاصل ہے کہ جن کے دبدبے کو دیکھ کر لوگ خیال کرتے ہوں کہ بھلا ان کو کون ہلا سکے گا انہیں ایسا گرائے کہ دنیا کے لیے نمونۂ عبرت بن جائیں، اور جنہیں دیکھ کر کوئی گمان بھی نہ کر سکتا ہو کہ یہ بھی کبھی اٹھ سکیں گے انہیں ایسا سربلند کرے کہ دنیا میں ان کی عظمت وبزرگی کے ڈنکے بج جائیں[1]"۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسلام سے قبل بھی کئی انبیاء کو ریاستوں کی حکمرانی عطا فرمائی تھی جن میں سے حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام قابل ذکر ہیں۔ ان انبیاء کی قائم کردہ ریاستوں میں قانونی امور و معاملات کس طرح کے تھے؟ ان کے بارے میں قرآن وحدیث میں صراحت نہیں ملتی ہے البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست میں امن عامہ قائم رکھنے کے لیے جن اہم امور کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾[2]

ترجمہ: بلاشبہ یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو کو نازل کیا، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

اس آیت کے تحت مولانا عبد الرحمان کیلانی لکھتے ہیں کہ:

"میزان سے مراد ناپ تول کے پیمانے بھی ہیں۔ تاکہ لوگوں کو ان کے حقوق پورے پورے ادا کیے جاسکیں اور نظام عدل کو قائم کرنے کے تقاضے اور ہدایات بھی جو کتاب وسنت میں تفصیل سے مذکور ہیں۔ اور لوہا سے مراد ڈنڈا یا طاقت اور قوت نافذہ بھی ہے جو عدالتوں کو حاصل ہوتی ہے کیونکہ جو لوگ لاتوں کے بھوت ہوں وہ باتوں سے کبھی نہیں مانتے اور جنگی یا سیاسی قوت اور سامان جنگ بھی جو بالعموم لوہے سے ہی تیار کیا جاتا ہے جیسے توپ وتفنگ، تیر، تلوار، میزائل، بندوقیں، رائفلیں، اور کلاشنکوفیں وغیرہ۔ تاکہ ان رکاوٹوں کو دور کیا جاسکے جو اسلام کے نفاذ کی راہ میں حائل ہوں۔ ربط مضمون کے لحاظ سے لوہا سے مراد اسلحہ اور جنگی قوت لینا ہی زیادہ مناسب ہے[3]"۔

چنانچہ مذکورہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کے مندرجہ ذیل مقاصد ہیں:

نماز قائم کرنا (عبادات کی جانب لوگوں کا رجحان پیدا کرنا)

نماز کا قیام ہر مسلمان پر لازم ہے اور قرآن مجید میں تقریباً اسی مرتبہ اللہ تعالیٰ نے نماز کے قائم کرنے کا حکم دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کے لیے اس کی حیثیت اہم ترین فریضے کی ہے۔ چنانچہ

---

1 ۔ مودودی، ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، (لاہور: ادارہ ترجمان القرآن)، 3/234

2۔ الحدید:25

3۔ عبد الرحمان کیلانی، تیسیر القرآن، (مکتبۃ السلام، لاہور، 1432ھ)، 4/382

اسلامی ریاست میں قیامِ نماز کے لیے ترغیب اور ترہیب دونوں راستے اختیار کیے جانے چاہییں۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ:

"اللہ کے مدد گار اور اس کی تائید و نصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں کہ اگر دنیا میں انہیں حکومت و فرمانروائی بخشی جائے تو ان کا ذاتی کردار فسق و فجور اور کبر و غرور کے بجائے اقامت صلوٰۃ ہو[1]"۔

اسی سے ملتے جلتے افکار و خیالات ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاں ملتے ہیں۔ انہوں نے قرآنی آیات میں مذکور ریاستِ اسلامی کے مقاصد کو سیرت کے روشن گوشوں کے ساتھ مربوط کرتے ہوئے قرآن و سنت کو ایک ہی دائرہ میں مثالیت کا نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ:

"مومنین کو اگر کسی ملک پر حکومت کرنے کا اختیار ملے گا تو وہ اپنی پہلی ترجیح کے طور پر نماز کا نظام قائم کریں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پہنچتے ہی جمعہ کے قیام کا اہتمام فرمایا اور اقامتِ صلوٰۃ کے لیے ترجیحی بنیادوں پر مسجد نبوی کی تعمیر کی[2]"۔

قیامِ نماز کے یقینی بنانے میں قرآن و حدیث کے کئی تاکیدی دلائل کار فرما ہیں۔ جس قوم میں نماز ترک کرنا ایک مستقل عادت بن جائے وہ مسلمان ہونے کے دعوے میں بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت ترک نماز کو شرک سے تعبیر کرتی ہے:

﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾[3]

ترجمہ: نماز قائم کرو اور شرک کرنے والوں سے نہ ہو جاؤ۔

نبی اکرم ﷺ کے کئی فرامین اسی موقف کی تائید کرتے ہیں:

((لَيْسَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ إِلَّا تَرْكُ الصَّلَاةِ))[4]

ترجمہ: بندے اور کفر کے درمیان حد فاصل نماز کا ترک کرنا ہے۔

((لَيْسَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَالشِّرْكِ إِلَّا تَرْكُ الصَّلَاةِ، فَإِذَا تَرَكَهَا فَقَدْ أَشْرَكَ))[5]

ترجمہ: بندے اور شرک کے درمیان نماز چھوڑنے کا فرق ہے، جب اس نے نماز چھوڑ دی تو شرک کیا۔

1۔ مودودی، تفہیم القرآن، 3/234

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، (انجمن خدام القرآن، پشاور)، 5/138

3۔ الروم:31

4۔ ابو داؤد، سلیمان بن الأشعث السجستانی، سنن ابو داؤد (بیروت: دار ابن حزم، 1997)، کتاب السنۃ، باب فی رد الارجاء، ح4678

5۔ ابن ماجۃ، محمد بن یزید ابو عبد اللہ القزوینی، سنن ابن ماجہ (ریاض: مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع، 1417ھ)، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب ماجاء فیمن ترک الصلاۃ، ح1080

چونکہ ترکِ نماز کا شرک کے مترادف ہونا قرآنی آیت اور احادیث سے ثابت ہے اس لیے اسلامی ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد لوگوں کو اس کفر سے دور رکھنا ہے۔

زکوٰۃ دینا (اسلامی معاشی نظام کا نفاذ)

اسلام میں انسانی مساوات کو انتہائی سنجیدہ انداز کا مسئلہ قرار دیا ہے اور اس کا حل یہ پیش کیا ہے کہ رنگ، نسل، زبان اور قومیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تمام لوگوں کو مساوی درجہ دیا جائے۔ اس مساوات کے نتیجے میں امیر اور غریب کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم ہو سکتا ہے جس کے ذریعے غربا، مساکین اور مفلس لوگوں کے مالی اور معاشی مسائل کا حل نکالنے کے لیے زکوٰۃ اور صدقات کی راہ اختیار کی جائے گی۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم کئی مقامات پر دیا ہے اور زکوٰۃ کے منکرین کے خلاف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جنگیں لڑیں۔ ان منکرین کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ریاست کے قیام کے مقاصد میں معاشی اصلاحات اور صدقات وزکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے عوام کو ترغیب وترہیب کے ساتھ آمادہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ مختصر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کا دوسرا مقصد غربا اور مساکین کے پرسان حالی ہے۔ سید مودودی لکھتے ہیں کہ:

> "اللہ کے مددگار اور اس کی تائید ونصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں کہ اگر دنیا میں انہیں حکومت و فرمانروائی بخشی جائے تو۔۔۔ ان کی دولت عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے بجائے ایتائے زکوٰۃ میں صرف ہو[1]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے بھی اسی ضمن میں اسلامی ریاست کے امتیازی وصف کے طور پر زکوٰۃ کو دوسرا بڑا مقصد قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "مومنین کو اگر کسی ملک پر حکومت کرنے کا اختیار ملے گا تو وہ۔۔۔ پھر زکوٰۃ کا باقاعدہ نظام قائم کیا جائے گا تاکہ معاشرے کے پس ماندہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کی کفالت کا بندوبست ہو سکے[2]"۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اہلِ ایمان کو جس سرزمین پر خلافت سے نوازا جائے گا وہ اس میں نیکی کا حکم "امر بالمعروف" دینے کے مشن کو بھرپور طریقے سے ادا کریں گے۔ اس ضمن میں سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور

---

1 ۔ ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، 3/234

2 ۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، 5/138

تعلیمی سطح پر ہر زاویے سے ایسے اقدامات کیے جائیں گے جن کے ذریعے معاشرہ معروف اور حسنات میں آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُم مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ﴾[1]

ترجمہ: تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو، جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر تھا، ان میں سے کچھ مومن ہیں اور ان کے اکثر نافرمان ہیں۔

چنانچہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف امت کا انتظامی ہی نہیں بلکہ اصلاحی فریضہ بھی ہے اور یہ اس وقت بھی واجب الادا ہے جب اسلامی ریاست قائم نہ ہو چکی ہو۔ جب اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ چکا ہو تب اس کی فرضیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

سید مودودی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> "اللہ کے مددگار اور اس کی تائید و نصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں کہ اگر دنیا میں انہیں حکومت و فرمانروائی بخشی جائے تو۔۔۔۔۔۔ان کی حکومت نیکی کو دبانے کے بجائے اسے فروغ دینے کی خدمت انجام دے[2]"۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد اور سید مودودی نے زندگی بھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مشن و جاری و ساری رکھا۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی تصنیفی اور تالیفی خدمات کے ساتھ ساتھ دعوتی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل رہ کر نجی سطح پر ہر ممکن کوشش کی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے اسی طرزِ عمل کی ترغیب دیتے ہوئے حکم جاری فرمایا کہ:

((مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ الإِيمَانِ))[3]

ترجمہ: جو شخص تم میں سے کسی منکر (خلاف شرع) کام کو دیکھے تو اس کو مٹا دے اپنے ہاتھ سے، اگر اتنی طاقت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر اتنی بھی طاقت نہ ہو تو دل ہی سے سہی (دل میں اس کو برا جانے اور اس سے بیزار ہو) یہ سب سے کم درجہ کا ایمان ہے۔

1۔ آل عمران:110

2 ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، سورۃ الحج، حاشیہ نمبر:85

3۔ مسلم، مسلم بن الحجاج القشیری النیسابوری، صحیح مسلم (بیروت: دار الجیل، 1334ھ)، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان وان الایمان یزید وینقص وان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر واجبان، ح86

انسان خطا کا پتلا ہے اس لیے اس سے جرائم اور گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ ان جرائم کا سدباب کرنے کے لیے اسلامی فقہ میں سزاؤں کو حدود اور تعزیرات کی صورت میں متعارف کرایا گیا ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد لوگوں کو سزائیں دینا نہیں ہے بلکہ اس کی مقصدیت میں امن عامہ کا قیام کا فرما ہے۔ اس امن کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ نہی عن المنکر کو زبان اور طاقت واستعداد کے ذریعے عمل جامہ پہنایا جائے۔

ناپ تول میں وزن کی برابری رکھنا (تجارتی امور میں دیانت داری کو قائم کرنا)

انسانی زندگی میں لین دین اور دیگر معاشی سرگرمیوں کی ناگزیریت سے کوئی انکار نہیں ہے۔ مسلمان معاشرے میں حکومت کی اولین ذمہ داری ہے کہ معاشی پہلو میں توازن اور دیانت داری کے عنصر کو یقینی پہلو کے طور پر قائم رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾[1]

ترجمہ: اور ماپ کو پورا کرو، جب ماپو اور سیدھی ترازو کے ساتھ وزن کرو۔ یہ بہترین ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت زیادہ اچھا ہے۔

یہ وہی عمل ہے جس سے روگردانی کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو عذاب استیصال سے دوچار کر دیا تھا۔

انصاف قائم کرنا (عدالتی نظام کو غیر جانب دار رکھنا)

معاشرہ امیر، غریب، طاقت ور اور کمزور میں منسقم ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے جہاں امیر اور طاقت ور کے لیے الگ اور غریب و کمزور کے لیے الگ قانون ہو وہاں انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس معاشرے کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں۔ چنانچہ اسلامی ریاست کے قیام کے مقاصد میں ایک اہم مقصد انصاف کا قیام بھی ہے جس میں کسی شخص کو طاقت ور یا امیر ہونے کی بنا پر اس کے جرائم کی سزا سے چھٹکارا نہیں مل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

((وَايْمُ اللَّهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعَ مُحَمَّدٌ يَدَهَا))[2]

ترجمہ: "اللہ کی قسم! اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا"۔

اسلامی ریاست کے قیام کے مذکورہ مقاصد کو امت کے جمہور علماء نے تسلیم کیا ہے اور ان کے نفاذ کی بھرپور تاکید کی ہے۔ ان کی طاقت بدیوں کو پھیلانے کے بجائے ان کے دبانے میں استعمال ہو۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے

1۔ الاسراء:35

2 مسلم، صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب اقامۃ الحدود علی الشریف والضعیف، ح4428

مقصدیت کے نقطہ نظر سے آگے بڑھتے ہوئے مذکورہ امور کو اسلامی ریاست کے منشور کا حصہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں حکومت کی زمام کار سنبھالنے والوں کے لیے لازم ہے کہ وہ مذکورہ مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے سیاسی منشور کو تشکیل دیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ:

"ان میں سے خصوصی طور پر یہ آیت حضور ﷺ کے مدینہ تشریف آوری کے فورا بعد کی صورت حال کے لیے ایک منشور کا درجہ رکھتی ہے۔ چونکہ عنقریب مدینہ میں آپ ﷺ کا ورود ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت سے ہونے والا تھا اور مدینہ پہنچتے ہی آپ ﷺ کو اختیار و اقتدار ملنے والا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے پیشگی بتادیا کہ اس صورت حال میں آپ ﷺ کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ چنانچہ جس طرح آج کل ہر سیاسی پارٹی الیکشن سے پہلے اپنا منشور جاری کرتی ہے کہ حکومت ملنے کی صورت میں ہماری ترجیحات کیا ہوں گی، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہل ایمان کو ہمیشہ کے لیے ایک منشور عطا کر دیا ہے کہ کسی ملک میں اقتدار ملنے کی صورت میں انہیں کون کون سے امور ترجیحی بنیادوں پر انجام دینے ہوں گے[1]"۔

عدل اور ریاست کے مابین مقصدیت کے تعلق کو سمجھنے کے لیے سابقہ انبیاء میں سے حکمران انبیاء کی سیرتوں کا مطالعہ انتہائی معاون ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو بنی اسرائیل کا پیغمبر اور حکمران بنا کر مبعوث فرمایا اور ان کو حکم دیا کہ:

﴿يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾[2]

ترجمہ: اے داؤد! بے شک ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، سو تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ یقیناً وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے، اس لیے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔

نبی اکرم ﷺ نے مدینہ میں اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالی تو وہاں آپ ﷺ کو حتمی فیصلوں کا اختیار دیا گیا تھا۔ روایات میں ایسے کئی واقعات موجود ہیں جن کا فیصلہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ ان میں کچھ واقعات غیر مسلموں کے بھی تھے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کے حکمران ہونے کے ناطے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا تھا کہ اگر کسی غیر مسلم کا معاملہ آپ ﷺ کی عدالت میں آئے تو بھی آپ عدل و انصاف کی مقصدیت کو نظر انداز نہیں کریں:

﴿وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾[3]

1۔ ڈاکٹر اسرار، بیان القرآن، 5/139

2۔ ص:26

3۔ المائدہ:42

ترجمہ: اگر تو فیصلہ کرے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

مذکرہ تمام اہم امور کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بعید نہ ہو گا کہ اسلامی ریاست کے قیام کے مقاصد میں روحانی اور مادی، ہر دو اعتبار سے انتظامی احکام لاگو ہوتے ہیں

اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیات

اسلامی ریاست کی بنیاد دین اور شریعت کی تعلیمات پر عمل کرنے پر رکھی گئی ہے اس لیے اس کی نوعیت امتیازی اوصاف سے معمور منفرد ریاست ہے۔ اس فصل میں اسلامی ریاست کی ان خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بناپر اسلامی ریاست غیر مسلم ریاستوں سے ممتاز قرار پاتی ہے۔

خطہ زمین پر خدا کی نیابت

قرآنی تعلیمات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾[1]

ترجمہ: اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا بے شک میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور بہت سے خون بہائے گا اور ہم تیری تعریف کے ساتھ ہر عیب سے پاک ہونا بیان کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ فرمایا بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

اس نیابت کا اہم ستون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار کی محدود طاقت عطا کی اور وہ خیر و شر کے درمیان کسی ایک راہ کو منتخب کرنے میں مختار قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ﴾[2]

ترجمہ: اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمھیں زمین میں ٹھکانا دیا اور ہم نے تمھارے لیے اس میں زندگی کے سامان بنائے، بہت کم تم شکر کرتے ہو۔

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ﴾[3]

ترجمہ: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تمھاری خاطر مسخر کر دیا ہے زمین کے چیزوں کو۔

1۔ البقرہ:31

2۔ الاعراف:10

3۔ الحج:65

مسلمانوں کے ہاں اسلامی ریاست کے وجود سے متعلق اولین تصور یہی رہا ہے کہ یہ زمین اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس پر انسان کا اختیار محض عارضی ہے۔ یہ تصور محض عقائد میں ہی نہیں بلکہ عملی مثالوں میں بھی موجود رہا ہے۔ چنانچہ مسلمان حکمران کے لیے لازم تھا کہ وہ سب سے پہلے اپنے ذات کو تعلیمات خدائی کے سامنے جھکائے اور اس کے بعد اپنی رعیت کو اسی راستے پر گامزن کرنے کے لیے اپنے اختیارات کا جائز استعمال کرے۔ اس کو اسلامی خلافت بھی کہا جاسکتا ہے۔ سید مودودی لکھتے ہیں:

> "اس خلافت کا جو تصور قرآن میں دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ زمین میں انسان کو جو قدرتیں بھی حاصل ہیں خدا کی عطا اور بخشش سے حاصل ہیں۔ خدا نے خود انسان کو اس حیثیت میں رکھا ہے کہ وہ اس کی بخشی ہوئی طاقتوں کو اس کے دیے ہوئے اختیار سے اس کی زمین میں استعمال کرے۔ اس لیے انسان یہاں خود مختار و مالک نہیں بلکہ اصل مالک کا خلیفہ ہے[1]"۔

خدا کو خلافت کی اولین قوت مان لینا اسلامی ریاست کی ایسی خصوصیت ہے جو اس کے شہریوں اور حکمرانوں کو اپنے ذاتی، قومی اور مفادات سے مستغنی کر دیتی ہے اور اس میں قائم ہونے والا سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور خاندانی نظام روحانی بنیادوں پر تشکیل پاتا ہے۔ یہ کہنا بعید از حق نہیں ہو گا کہ اسلامی ریاست میں اقتدار کا ستون الٰہیاتی بنیادوں کا نقطہ آغاز ہے۔

پارلیمانی نظام

اسلامی ریاست میں کوئی بھی شخص مطلق العنان حکمران بن کر قابض نہیں ہو سکتا ہے بلکہ یہاں منصبِ سیادت پر سرفراز شخص رہنما کی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے لیے اپنی مرضی و منشا کے مطابق حکومتی انتظام و انصرام چلانا جائز نہیں ہوتا بلکہ ملک کی زمامِ کار کو عملی صورت میں ڈھالنے کے مرحلہ سے قبل وہ عوام کی آراء و منشا کا پاس رکھنے کے لیے عوامی نمائندوں پر مشتمل مجلسِ شوریٰ کے ساتھ مشاورت کرنے کا پابند ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوی اور عہدِ خلفاء میں مشاورت کا یہ نظام انتہائی موثر اور طاقت ور اصحاب رائے کی موجودگی میں تشکیل پا چکا تھا اور اس کے خاطر خواہ فوائد بھی سامنے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ:

﴿وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ﴾[2]

ترجمہ: اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم کی اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے اور ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ:

1۔ مودودی، خلافت و ملوکیت، ص 33

2۔ الشوریٰ: 38

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ﴾[1]

ترجمہ: ان سے مشورہ کر لیا کرو۔

اہلِ فکر و رائے پر مشتمل یہ مجلس شوریٰ جدید پارلیمانی نظام کے قریب تر ہے۔ پارلیمانی نظام میں عوامی نمائندوں کی مشاورت کے ذریعے کی حکومتی اقدامات کی منظوری دی جاتی ہے۔ عہدِ حاضر میں اس کو خوب پذیرائی دی جارہی ہے۔ شوریٰ کی اہمیت و ضرورت کے پیشِ نظر مسلمانوں کی تاریخ میں شورائی نظام کی مثالیں ہر دور میں ملتی ہیں۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اس کو مجلس قانون ساز کا نام دیا ہے اور ان کا موقف ہے کہ:

"اس مجلس کی ترکیب، اس کے کام کا ضابطہ اور اس کے ارکان کے انتخاب کا طریقہ اسلام میں مقرر نہیں کیا گیا ہے، اس کے لیے ہر زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے اس کی الگ الگ شکلیں اختیار کی جاسکتی ہیں[2]"۔

مجلس شوریٰ کے دائرہ کار سے متعلق فقہا کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ ابن عربی اور امام طبری وغیرہ کا موقف ہے کہ دنیاوی امور میں مجلسِ شوریٰ کو عمل میں لایا جائے گا اور ان میں معاشی و عسکری معاملات شامل ہیں۔ جب کہ جصاص اور آلوسی ایسے فقہا کے دوسرے گروہ کا موقف ہے کہ وہ تمام امور، خواہ ان کا تعلق دینی معاملات کے ساتھ ہے یا دنیاوی معاملات کے ساتھ، مجلس شوریٰ کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر وہبہ ذحیلی ان کے دلائل کا تذکرہ کرنے کے بعد اپنا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فقہا کے دوسرے گروہ کا موقف دلائل اور منطق کے اعتبار سے زیادہ پختہ اور موثر معلوم ہوتا ہے کیونکہ مشاورت پر دلالت کرنے والی قرآنی آیت مشاورت کے مطلق حکم پر مشتمل ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے انتظامی، ثقافتی، اقتصادی، اجتماعی، سیاسی، دنیوی اور دینی ایسے جملہ معاملات شامل ہیں جن کے بارے میں نص نازل نہ ہوئی ہو[3]۔

دوسری جانب سید مودودی کا موقف ہے کہ اسلامی عبادات توقیفی ہیں اور ان میں کسی قسم کا تغیر پیدا کرنا حرام ہے۔ اس لیے مجلس قانون سازیا مجلس شوریٰ کے ذریعے عبادات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی جاسکتی ہے۔ البتہ:

"عبادات کے علاوہ معاملات کے اس دائرے میں قانون سازی کی گنجائش موجود ہے جس میں کتاب و سنت خاموش ہے[4]"۔

سید مودودی کے مطابق مشاورت کے دائرہ کار میں چار چیزیں آتی ہیں:

1. اوامر و نواہی سے متعلق نصوص کی تعبیر

1۔ آل عمران:159

2۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص481

3۔ مجموعہ علماء، الشوریٰ فی الاسلام، (عمان: المجمع الملکی لبحوث الحضارۃ الاسلامیہ)، 2/542

4۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص454

2. قیاس کی مدد سے نئے امور سے موافق شرعی امور کے مابین علتِ حکم کی تشخیص کرنا
3. اجتہاد و استنباط کے ذریعے شرعی اصولوں کی مدد سے جزوی امور کو نمٹانا
4. مقاصد الشریعہ اور مصالح مرسلہ کو مد نظر رکھتے ہوئے شرعی تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کا حل تلاش کرنا جن کے بارے میں شارع نے تعلیمات نہیں دی ہیں[1]۔

انسانی حقوق کی پاس داری

اسلامی ریاست کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان دوستی کی اولین علم بردار ہے۔ مغربی تصور ریاست میں انسان دوستی نے بیسویں صدی میں جگہ بنائی جب کہ اسلام نے حقوق انسانی کو اسلام کے سیاسی و اخلاقی تصورات میں اساسی مقام دیا ہے۔ قرآن کریم نے مندرجہ ذیل انسانی حقوق کو مسلمان ریاست میں لازم قرار دیا ہے:

جان کا تحفظ

اس وقت پوری دنیا میں ہیومنزم کا فلسفہ مقبول ترین ہو چکا ہے جس میں انسانی جان کو تمام امور پر فوقیت دی گئی ہے اور حقوق انسانی کے ہر منشور میں انسانی جان کا تحفظ یقینی بنانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اسلامی ریاست میں بھی انسانی جان کے تحفظ کو ریاست اور اس کے باشندوں کی اہم ترین ذمہ داری کے طور پر شمار کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا﴾[2]

ترجمہ: اور اس جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو شخص قتل کر دیا جائے، اس حال میں کہ مظلوم ہو تو یقیناً ہم نے اس کے ولی کے لیے پورا غلبہ رکھا ہے۔ پس وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے، یقیناً وہ مدد دیا ہوا ہو گا۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ چند صورتوں میں انسانی جان کا قتل اسلام میں جائز ہے۔ ان میں خون کا بدلہ خون' اسلامی ریاست میں مرتد کی سزا موت، شادی شدہ زانی اور زانیہ کا رجم اور حربی کافر کا قتل شامل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قتل کے مقدمات میں ریاست یا حکومت مدعی نہیں بنے گی' بلکہ مقتول کے ورثاء ہی مدعی ہوں گے۔ ہمارے ہاں جو "سرکار بنام فلاں" کے عنوان سے مقدمہ بنتا ہے وہ معاملہ سراسر غیر اسلامی ہے[3]۔"

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص454-455

2۔ بنی اسرائیل:33

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، 4/302، 303

سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ دوسروں کو قتل کرنے کی طرح خود اپنی جان لینا، یعنی خود کشی کرنا بھی اسلام میں حرام ہے[1]۔"

مال کا تحفظ

زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ انسان خوراک اور دیگر بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مال کمائے۔ عملِ اکتساب میں مصروف عمل لوگوں کے لیے اسلامی ریاست کے باشندوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال اور حرام کے پیمانے عطا فرمائے ہیں جن کی مدد سے وہ اپنے مال کو حرام اور ناجائز طریقوں سے پاک رکھ کر عدل و انصاف اور راست روی کی راہ پر گامزن رہ کر معاشی امن پیدا کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾[2]

ترجمہ: اور اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے مت کھاؤ اور نہ انہیں حاکموں کی طرف لے جاؤ، تاکہ لوگوں کے مالوں میں سے ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ، حالانکہ تم جانتے ہو۔

اس آیت کے ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ اسلامی ریاست میں ہر مسلمان کا بنیادی فرض یہی ہے کہ وہ اکتساب مال میں حلال کی طرف جائے اور ایسا شخص جو حرام خوری کی روش اختیار کیے ہوئے ہے وہ متقی نہیں ہے[3]۔

مولانا مودودی کے مطابق مذکورہ آیت میں رشوت دینے اور لینے کی ممانعت آئی ہے نیز اس میں حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنی چرب زبانی کی بنیاد پر حاکم یا قاضی سے کسی کا حق اپنی ملکیت میں لینے سے گریز کیا جائے[4]"۔

مال کے تحفظ کے ضمن میں ہی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾[5]

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے مال آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ، مگر یہ کہ تمھاری آپس کی رضامندی سے تجارت کی کوئی صورت ہو اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تم پر ہمیشہ سے بے حد مہربان ہے۔

1۔ مودودی، تفہیم القرآن، 2/614

2۔ البقرہ:188

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، 1/265

4۔ مودودی، تفہیم القرآن، 1/

5۔ النساء:29

سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں دو لوگوں کا لین دین تجارت کے اصول پر ہونا چاہیے کیونکہ تجارتی معاملہ میں فریقین ایک دوسرے کو فائدہ پہنچاتے ہیں جب کہ رشوت ستانی کی صورت میں رشوت دینے والا محض جیت پر رضامند ہوتا ہے اسی طرح جعل سازی میں فریقین ناجائز امر پر رضامند ہوتے ہیں[1]۔

اسی سے ملتا جلتا موقف ڈاکٹر اسرار احمد نے پیش کرتے ہوئے تجارت کو راست گوئی کی بنیاد پر عملی زندگی کا حصہ بناتے ہوئے سیدھے طریقے سے اپنانے کی ترغیب دی ہے۔ ان کا موقف ہے کہ اگر کوئی مسلمان غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کسی چیز کی خرید و فروخت کرے گا تو اس کا یہ عمل حرام کمائی کا سبب بن جائے گا[2]۔

عزت کا تحفظ

معاشرتی زندگی میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کے مابین محبت و پیار کا رشتہ استوار ہو۔ اسی پہلو سے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم صادر فرمایا ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ-يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ﴾[3]

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کوئی قوم کسی قوم سے مذاق نہ کرے، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ کوئی عورتیں دوسری عورتوں سے، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ اپنے لوگوں پر عیب لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو برے ناموں کے ساتھ پکارو، ایمان کے بعد فاسق ہونا برا نام ہے اور جس نے توبہ نہ کی سو وہی اصل ظالم ہیں۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت سے گمان سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہیں اور نہ جاسوسی کرو اور نہ تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے بھائی کا گوشت کھائے، جب کہ وہ مردہ ہو، سو تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔

1۔ مودودی، تفہیم القرآن، 1/ النّسآء، حاشیہ نمبر:50

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، 2/142

3۔ الحجرات:12،11

سید ابو الاعلیٰ مودودی کے مطابق سورۃ حجرات کی مذکورہ آیت اور اس کی تشریحات کی روشنی میں ایک مکمل اسلامی قانونِ ہتک عزت مرتب کیا جاسکتا ہے[1]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس پہلو کو سماجی اخلاقیات کے ضمن میں پیش کرتے ہوئے ترغیب دی ہے کہ مسلمان ریاست کے تمام افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے جسمانی خدوخال پر طعن نہ کریں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ بظاہر دوسروں سے بد صورت نظر آنے والا فرد عملی زندگی میں خوبصورت نظر آنے والے سے زیادہ متقی اور معاشرے کے لیے مفید تر ہو[2]۔

نجی زندگی کا تحفظ

انسان کی نجی زندگی یا اس کی پرائیویسی کے تحفظ کا حق اس کو دنیا کے ہر قانون میں ملتا ہے۔ اس کو انسان کے بنیادی حقوق کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اسلام نے اس حق کا بھرپور لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو حکم دے رکھا ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾[3]

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے گھروں کے سوا اور گھروں میں داخل نہ ہو، یہاں تک کہ انس حاصل کر لو اور ان کے رہنے والوں کو سلام کہو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

سید مودودی کے مطابق جس طرح کسی فرد کو کسی کے گھر میں بغیر اجازت گھسنے یا تانک جھانک کرنے کی اجازت نہیں ہے اسی طرح ریاست کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شہری کی نجی زندگی کے بارے میں خفیہ معلومات اکٹھی کرتی رہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس حکم سے مستثنیٰ صرف وہ مخصوص حالات ہیں جن میں بخشش کی فی الحقیقت ضرورت ہو۔ مثلاً کسی شخص یا گروہ کے رویے میں بگاڑ کی کچھ علامات نمایاں نظر آرہی ہوں اور اس کے متعلق یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ کسی جرم کا ارتکاب کرنے والا ہے تو حکومت اس کے حالات کی تحقیق کر سکتی ہے۔ یا مثلاً کسی شخص کے ہاں کوئی شادی کا پیغام بھیجے، یا اس کے ساتھ کوئی کاروباری معاملہ کرنا چاہے تو وہ اپنے اطمینان کے لیے اس کے حالات کی تحقیق کر سکتا ہے[4]۔

1۔ مودودی، تفہیم القرآن، سورۃ الحجرات، حاشیہ نمبر:19

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، 6/475

3۔ النور:27

4۔ مودودی، تفہیم القرآن، سورۃ الحجرات، حاشیہ نمبر:25

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق یہ اسلامی معاشرے کا اخلاقی پہلو ہے کہ اگر گھر والے کسی شخص کو اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے ہیں تو داخل ہونے والا فرد اس پر معترض نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اجازت نہ ملنے کی صورت میں چپ چاپ واپس چلا جائے۔ اسلامی ریاست میں کسی شخص کو کسی کی نجی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے[1]۔

دعوت و تبلیغ کے حق کا تحفظ

وہ اقوام جنہوں نے اسلام کے قبل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اغماض کیا تھا، دنیا سے مٹا دی گئی تھیں۔ کچھ اقوام کو اللہ تعالیٰ نے عبرت کے نمونے کے طور پر نشانات میں زندہ رکھا اور بعض اقوام کے افراد کو ذلت وخواری میں مبتلا کر کے دوسروں کے لیے مثال بنا دیا تھا۔ قرآن مجید میں اس اعتبار سے یہود کو اللہ تعالیٰ نے مثال کے طور پر ذکر فرمایا ہے:

﴿لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ- كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾[2]

ترجمہ: وہ لوگ جنہوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا، ان پر داؤد اور مسیح ابن مریم کی زبان پر لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو کسی برائی سے، جو انہوں نے کی ہوتی، روکتے نہ تھے، بے شک برا ہے جو وہ کیا کرتے تھے۔

یہودیوں کے انجام کار کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلامی ریاست کے علماء کی ذمہ داریوں سمجھ آتی ہے کہ:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ﴾[3]

ترجمہ: تم سب سے بہتر امت چلے آئے ہو، جو لوگوں کے لیے نکالی گئی، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے لیے بہتر تھا، ان میں سے کچھ مومن ہیں اور ان کے اکثر نافرمان ہیں۔

اس مشن کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اس معاشرے کو نابود کر دیا جہاں شر اور فساد بہت زیادہ ہو جائے اور اس کو روکنے کے لیے دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے افراد ہی موجود نہ ہوں۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، 5/207، 208

2۔ المائدہ: 78،79

3۔ آل عمران: 110

﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنْجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾[1]

ترجمہ: پھر جب وہ اس بات کو بھول گئے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے منع کرتے تھے، اور ان کو سخت عذاب میں پکڑ لیا جنہوں نے ظلم کیا تھا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

سید مودودی کا موقف ہے کہ دنیا کی امامت انہی اقوام کے ہاتھ ہوتی ہے جو اعمال صالحہ کو اختیار کرتے ہیں اور دوسروں میں اس جذبہ کو فروغ دینے میں مصروف عمل رہتے ہیں[2]۔ اللہ عزوجل خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامتہ الناس کی یہ حالت نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے برے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا یہ حال ہو جاتا ہے تو اللہ خاص و عام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے[3]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس معاشرے کو سنڈاس قرار دیا ہے جس میں برائیاں پورے زور و شور سے پنپ رہی ہوں اور نیکی کی جانب گامزن کرنے کے لیے دعوت و تبلیغ کا کوئی انتظام نہ ہو۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ فسق و فجور کو دیکھتے ہوئے خاموشی سادھ لینے کے بجائے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی راہ اپنائے[4]۔ دوسری جگہ انہوں نے اس کام کو پوری قوم کا فرضِ منصبی قرار دیا ہے[5]۔

مذہبی آزادی کے حق کا تحفظ

دین کے انتخاب کا اختیار اسلامی ریاست کے ہر باشندے کو دیا گیا ہے اور قرآن مجید نے اس ضمن میں واضح تعلیمات دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾[6]

ترجمہ: دین میں کوئی زبردستی نہیں، بلاشبہ ہدایت گمراہی سے صاف واضح ہو چکی، پھر جو کوئی باطل معبود کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو یقیناً اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا، جسے کسی صورت ٹوٹنا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔

1۔ الاعراف:165

2۔ مودودی، تفہیم القرآن، آل عمران، حاشیہ:88

3۔ مودودی، تفہیم القرآن، الاعراف، حاشیہ نمبر:125

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، 2/297

5۔ ایضاً، ص:67

6۔ البقرہ:256

﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾[1]

ترجمہ: اور اگر تیرا رب چاہتا تو یقیناً جو لوگ زمین میں ہیں سب کے سب اکٹھے ایمان لے آتے۔ تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا، یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں؟

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَى رَبِّهِمْ مَرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾[2]

ترجمہ: اور انہیں گالی نہ دو جنہیں یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، پس وہ زیادتی کرتے ہوئے کچھ جانے بغیر اللہ کو گالی دیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کا عمل مزین کر دیا ہے، پھر ان کے رب ہی کی طرف ان کا لوٹنا ہے تو وہ انہیں بتائے گا جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔

﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَهُنَا وَإِلَهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ﴾[3]

ترجمہ: اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، مگر وہ لوگ جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا اور کہو ہم ایمان لائے اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور تمھاری طرف نازل کیا گیا اور ہمارا معبود اور تمھارا معبود ایک ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

مولانا مودودی کا موقف ہے کہ اسلام کا اعتقادی نظام اور اسلام کا اخلاقی نظام کسی بھی غیر مسلم پر زبردستی مسلط نہیں کیا جا سکتا ہے[4]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق کسی فرد کو جبراً مسلمان بنانا حرام ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ باطل نظام کو ختم کرنے کے لیے کوئی طاقت استعمال نہیں کی جا سکتی ہے۔ باطل نظام ظلم پر مبنی ہے اور یہ لوگوں کا استحصال کر رہا ہے۔ یہ اللہ اور بندوں کے درمیان حجاب اور آڑ بن گیا ہے۔ اس لیے باطل کے نظام کو قوت اور طاقت کے ساتھ ختم کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے[5]۔

1۔ یونس:99

2۔ الانعام:108

3۔ العنکبوت:46

4۔ مودودی، تفہیم القرآن، سورۃ البقرۃ حاشیہ نمبر:285

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، 1/326، 325

محض اپنے اعمال کے احتساب کی ذمہ داری

اسلامی ریاست میں کسی شخص کو اس جرم کی سزا نہیں دی جاسکتی ہے جس کا اس نے ارتکاب نہ کیا ہو۔ ہر فرد صرف اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جواب دہ سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى ثُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾[1]

ترجمہ: کوئی جان کمائی نہیں کرتی مگر اپنے آپ پر اور نہ کوئی بوجھ اٹھانے والی کسی دوسری کا بوجھ اٹھائے گی، پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھارا لوٹ کر جانا ہے، تو وہ تمھیں بتائے گا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔

﴿مَنِ اهْتَدَى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى﴾[2]

ترجمہ: جس نے ہدایت پائی تو وہ اپنی ہی جان کے لیے ہدایت پاتا ہے اور جو گمراہ ہوا تو اسی پر گمراہ ہوتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری (جان) کا بوجھ نہیں اٹھاتی۔

مولانا مودودی کا موقف ہے کہ اگر کسی شخص کی قوم یا اس کے خاندان کے لوگوں میں فسق و فجور پھیلنا شروع ہو جائے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ فاسقوں کے ساتھ اپنی رشتہ داری کا لحاظ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ان سے الگ کرلے کیونکہ اس پر اس کے اپنے اعمال کی جواب دہی کا بوجھ ہو گا۔ زیادہ لوگوں کا ایک کام کو اختیار کر لینا اس کی حلت یا اس کے جواز کا سبب نہیں بن سکتا ہے[3]۔ ان کے مطابق آیات میں وارد کلمہ "بوجھ" سے مراد اعمال کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، اور ہر ایک پر صرف اس کے اپنے ہی عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ اور نہ یہی ممکن کہ کوئی شخص کسی دوسرے کی ذمہ داری کا بار خود اپنے اوپر لے لے اور اسے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے جرم میں پکڑوادے[4]۔

ہر انسان اپنی ایک مستقل اخلاقی ذمہ داری رکھتا ہے اور اپنی شخصی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس ذاتی ذمہ داری میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔ اس لیے ایک دانش مند آدمی کو یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں، بلکہ اسے ہر وقت اس بات پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔ اگر

1۔ الانعام:164

2۔ بنی اسرائیل:15

3۔ تفہیم القرآن، سورۃ زمر، حاشیہ نمبر:22

4۔ ایضاً، سورۃ فاطر حاشیہ نمبر:39

اسے اپنی ذاتی ذمہ دار کا صحیح احساس ہو تو دوسرے خواہ کچھ کر رہے ہوں، وہ بہر حال اسی طرز عمل پر ثابت قدم رہے گا جس کی جواب دہی خدا کے حضور وہ کامیابی کے ساتھ کر سکتا ہو[1]"۔

مفلس ونادار طبقے کی کفالت کا حق

اسلامی ریاست کے اخلاقی وسیاسی نظام کی بنیاد خوفِ خدا اور خدمت خلق کے جذبے پر رکھی گئی ہے۔ یہاں ہر مستحق اور ضرورت مند انسان معاشرے کے متمول افراد کی ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾[2]

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محروم کے لیے ایک حصہ تھا۔

عوام کو ملنے والے ان حقوق کے بدلے میں ان پر اسلام نے کچھ ایسے فرائض بھی عائد کیے ہیں جو اسلامی ریاست میں رہنے والے ہر فرد کو ہر حال میں پورے کرنے ہیں۔ ان فرائض میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں:

حکمرانِ وقت کی فرماں برداری

اسلامی ریاست کی بہت اہم خوصوصیت ہے جس میں خود شارع کی طرف سے اس بات کا نصاً حکم دیا گیا ہے کہ جائز امور میں حاکم وقت کی فرمانبرداری رعایا کے فرائض میں سے ہے جبکہ غیر اسلامی نظام خود انسانوں کے وضع کردہ ہوتے جن میں شارع یا شرع کے کسی بھی قسم کے احکام کو بطور شرعی حکم ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

اسلامی ریاست میں عوام الناس کو محض حقوق کا مستحق قرار دے کر شتر بے مہار نہیں چھوڑا گیا ہے بلکہ ان پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ حکمرانِ وقت کی اطاعت و فرمانبرداری میں مصروف عمل رہیں اور کسی بھی قسم کے خروج یا بغاوت سے گریز کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾[3]

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں، پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے زیادہ اچھا ہے۔

1۔ تفہیم القرآن، سورۃ بنی اسرائیل، حاشیہ نمبر:16

2۔ الذاریات:19

3۔ النساء:59

اس ضمن میں مولانا مودودی کا موقف ہے کہ مسلمان ریاست کے باسیوں پر فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کے فرماں بردار بن جائیں اور اگر ان کے حکمران بھی ان کی مانند اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار بنے رہیں تو ان کی پیروی کی جانی چاہیے۔ اگر مسلمان ریاست کے حکمران اللہ تعالیٰ کے احکامات سے بغاوت کا ارتکاب کریں تو ان پر اپنے سیاسی رہنماؤں کی پیروی نہ کرنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں مولانا مودودی نے اطاعت امیر سے متعلق متعدد احادیث بھی پیش کی ہیں[1]۔

ڈاکٹر اسرار احمد بھی سید مودودی کے موقف کے حامی ہیں اور ان کا نظریہ ہے کہ پاکستان کے قانون میں یہ یقین دہانی کروائی گئی ہے کہ یہاں کوئی بھی آئین یا دستور کتاب و سنت سے متصادم نہیں ہو گا۔ لیکن عملی زندگی میں ابھی تک اس یقین دہانی کی کوئی متحرک صورت سامنے نہیں آسکی ہے اس لیے یہ دعویٰ اصل میں منافقت کا عکاس و غماز بن چکا ہے[2]۔

قوانینِ ریاست کی پابندی

اسلامی ریاست میں تمام کارہائے خیر میں عوام کو شامل ہو کر ریاست کے ساتھ عہد وفا باندھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کو ریاستی قوانین اور توازن قائم رکھنے والے قواعد پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾[3]

ترجمہ: اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)، اس نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں، بے شک تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آچکی۔ پس ماپ اور تول پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ، یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم مومن ہو۔

﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾[4]

ترجمہ: ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کی کوشش کرتے ہیں، یہی ہے کہ انہیں بری طرح قتل کیا جائے، یا انہیں بری طرح سولی دی جائے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف سمتوں سے بری طرح کاٹے جائیں، یا انہیں اس سرزمین سے نکال دیا جائے۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔

1۔ تفہیم القرآن، سورۃ النِّسآء حاشیہ نمبر:89

2۔ ڈاکٹر اسرار، بیان القرآن، ص:2/163

3۔ الاعراف:85

4۔ المائدہ:33

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنْ رَبِّهِمْ وَرِضْوَانًا وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوا وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾[1]

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! نہ اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی کرو اور نہ حرمت والے مہینے کی اور نہ حرم کی قربانی کی اور نہ پٹوں (والے جانوروں) کی اور نہ حرمت والے گھر کا قصد کرنے والوں کی، جو اپنے رب کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہیں، اور جب احرام کھول دو تو شکار کرو، اور کسی قوم کی دشمنی اس لیے کہ انہوں نے تمھیں مسجد حرام سے روکا، تمھیں اس بات کا مجرم نہ بنادے کہ حد سے بڑھ جاؤ، اور نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے۔

چنانچہ اسلام ان سب وجوہ کا خوبی سے تدارک کرکے مسلمانوں کو قانون کا پابند بناتا ہے، بہ ایں وجہ ایک طرف وہ انہیں خدا پرستی اور ایثار وسخاوت اور اکرامِ مسلم کا درس دیتا ہے تو دوسری طرف ان میں آخرت کی جواب دہی کا احساس وشعور پیدا کرتا ہے اور انہیں احساس دلانا چاہتا ہے کہ اگر وہ اپنے اثر ورسوخ یا دھوکے فریب سے دنیا میں قانون کی خلاف ورزی کی سزا سے بچ بھی گئے تو آخرت میں اُنہیں خدا کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

دنیا میں جہاں کہیں امن وسکون ہے، اس کا راز یہی ہے کہ وہاں کے باشندے قانون کے پابند ہیں، جہاں کہیں بگاڑ وانتشار ہے، بدامنی اور پریشانی ہے، وہاں قانون شکنی کی حکمرانی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے بدنِ انسانی ہمارے سامنے ہے کہ جب جسم کے نظام میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو بیماری لاحق ہو جاتی ہے اور بدنِ انسانی کا چین وسکون غارت ہو جاتا ہے۔ فتحِ مکہ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرکارِ دوعالم کی ہدایت کے تحت ان گھروں اور باغوں پر بھی قبضہ نہ کیا جن کو وہ ہجرت کے وقت چھوڑ گئے تھے، جو کہ قانون کی پابندی کی زندہ مثال ہے۔

1۔ المائدہ:2

فصل سوم

مسلمان ممالک میں روبہ عمل سیاسی نظام

جیسا کہ ہمارا موضوع "اسلامی ریاست کی تشکیل نوع" ہے تو اس کیلیے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ عصرِ حاضر میں اسلامی ممالک میں کون کونسے سیاسی نظام رائج ہیں، اس فصل میں ہم ان سیاسی نظاموں کا مطالعہ کریں گے۔

عصرِ حاضر میں جمہوریت کو حکومت کا بہترین طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے بیسویں صدی کے نصف چانی کے بعد دنیا میں جمہوری اقدار کو فروغ دینے کی مہم چل پڑی ہے لیکن دیگر دنیا کی نسبت مسلمان ممالک اس کو قبول کرنے میں پیچھے رہتے ہوئے نظر آرہے ہیں[1]۔

کسی بھی ملک میں جمہوریت کی اثر پذیری کو جانچنے اور ماپنے کا تا حال کوئی میزان تشکیل نہیں دیا جا سکا ہے[2]۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جمہوریت کی تعریف اور اس کی اساسی نوعیت کی تعیین میں ہی اختلاف کیا جارہا ہے۔ جمہوریت کی ترویج و ترقی کے لیے اس وقت ایک تنظیم فریڈم ہاؤس کے نام سے کام کر رہی ہے اور اس کی جانب سے ہر ملک میں موجود جمہوری اقدار کو جانچنے کے لیے مندرجہ ذیل زاویے طے کیے گئے ہیں:

1. ایک ایسا سیاسی نظام جس میں متعدد پارٹیاں ہوں اور ان کے مابین مقابلے کی فضا ہو۔
2. ہر بالغ کے پاس رائے دہی کا حق ہو۔
3. خفیہ صندوقوں کی بنیاد پر باقاعدگی سے کچھ عرصے بعد سیاسی امیدواروں کے مابین انتخابات کا انعقاد ہو۔
4. انتخابات میں ووٹ ڈالنے کے عمل کو معقول حفاظتی انتظامات ہوں تا کہ ووٹ جمع کروانے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو اور اس میں کسی دھاندلی کا امکان نہ ہو۔
5. آزاد انتخابی مہم اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام الناس کی سیاسی پارٹیوں تک رسائی ہو۔

بعینہ جمہوریت کی تعریف میں تنوع کی بنیاد پر دیگر سیاسی نمونے بھی پیش کیے جاتے ہیں اور ان میں بعض آزاد جمہوریت کے نام پر مقبولیت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے ایک کو Polyarchy کے نام سے Robert Dahl نے پیش کیا ہے جس کے مطابق اقتدار کی طاقت مختلف ہاتھوں میں سونپ دینا جمہوریت ہے۔ اس طرز کی سیاسی جمہوریت میں مندرجہ ذیل شرائط کو شامل رکھا گیا ہے[3]:

---

1. David Potter . *Explaining Democratization*. Cambridge: Polity Press 1997, P: 1
2. Laza Kekic. *The Economist Intelligence Unit's Index of Democracy*. London: , 2007, P: 1
3. Robert Dahl. *Democracy and its Critics*. Yale University press 1989, P: 221

- ملک کے نظام کو ملک کے دستور کی روشنی میں چلانے کے لیے منتخب نمائندوں کو مقرر کیا جائے۔
- ان نمائندوں کا تقرر آزادانہ اور عادلانہ انتخابات کے ذریعے کیا جائے۔
- ہر بالغ کو رائے دہی کا حق دیا جانا چاہیے۔
- ہر بالغ کو محکمہ انتخابات کے امور میں شرکت کا حق دیا جانا چاہیے۔
- شہریوں کو کسی بھی سزا یا جرمانے کے خوف سے آزاد ہو کر سیاسی معاملات میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی آزادی کا حق دیا جانا چاہیے۔ حقائق اور معلومات سے باخبر ہونے کے ذرائع تک شہریوں کو رسائی دی جانی چاہیے۔
- شہریوں کے پاس سیاسی پارٹی بنانے، کسی بھی سیاسی پارٹی کے ساتھ منسلک ہونے یا کسی بھی سیاسی پارٹی کے مفاد میں کام کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔

مذکورہ بالا تمام معیارات کی بنیاد پر کسی بھی ملک میں موجود جمہوری یا آزاد جمہوری اقدار کے نفاذ یا ترویج کو جانچا جا سکتا ہے خواہ وہ مسلمان ملک ہو یا غیر مسلم ملک ہو۔ چنانچہ اس فصل میں انہی معیارات کی بنیاد پر مسلمان ممالک میں جمہوریت کی نوعیت اور ہیئت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

ملائشیا

ملائشیا میں وفاقی پارلیمانی بادشاہت قائم ہے جس میں وزیر اعظم کو حکومت کی سربراہی دی گئی ہے اور بادشاہ ریاست کا سربراہ کہلاتا ہے جس کے پاس محض رسمی طاقت اور اقتدار ہے[1]۔ ملائشیا کو پارلیمانی نظام برطانوی حکومت سے ورثہ میں ملا ہے جس کے بعد سابقہ کئی عشروں سے ملائشیا میں انتخابات منعقد ہو رہے ہیں[2]۔

ملائشیا میں کئی سیاسی پارٹیاں ہیں اور وہاں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد اب تک ملائشیا میں ایک سیاسی پارٹی UMNO (United Malays National Organization) کو ہی سیاسی برتری حاصل رہی ہے اگرچہ اس برتری کی بنیاد دیگر سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اتحاد پر رکھی گئی ہے۔ ملائشیا میں ہونے والے انتخابات عموماً دھاندلی سے پاک ہوتے ہیں لیکن پھر بھی حکومت پر الزام ہے کہ اس کی جانب سے غالب اتحادی سیاست کو اقتدار میں لانے کے لیے دھاندلی کا ارتکاب کیا جاتا ہے[3]۔

1. Rainer Heufers. The Politics of Democracy Malaysia, Asian Numbers, Vol 85, October 2002, P. 41-44.
2. Ibid, p: 40
3. Ibid, p:48

سیاسی اعتبار سے قائم ہونے والے اتحاد کے ضمن میں حکومتوں پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ریاستی مشینری کو استعمال کر کے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی کوششیں کی ہیں اور جعلی ووٹوں کے ذریعے اپنے موییدین کی تعداد کو زیادہ ظاہر کیا ہے۔ ان الزامات کے بارے میں جب بھی تفتیش کی گئی ہے، سامنے آنے والی رپورٹوں میں الزام عائد کرنے والوں کی جانب سے ٹھوس ثبوت اور دلائل شامل نہیں رہے ہیں[1]۔

سیاسی اور سماجی حقوق کی بحث بہت وسیع ہے۔ کمیشن برائے انسانی حقوق ملائشیا نے ایسے متعدد قوانین پیش کیے جن کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ وہ لوگوں کے سیاسی اور سوال حقوق کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ ان میں پولیس ایکٹ سر فہرست ہے جس کے مطابق لوگ ایک جگہ اکٹھے ہونے کے مجاز نہیں ہیں۔ ان کا داخلی حفاظتی قانون (Internal Security Act) بغیر کسی چھان پھٹک اور تفتیش کے ہی کسی شہری کو گرفتار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ملائشیا کا قانون برائے نشر واشاعت (Printing Press & Publication Act) ذرائع ابلاغ کی آزادی میں ایک رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے[2]۔ حکومت پر الزام لگایا گیا ہے کہ اس نے ان قوانین کو امتیازی انداز میں استعمال کیا ہے[3]۔

حکومت مخالف سیاسی پارٹیوں کا الزام ہے کہ ذرائع ابلاغ حکومت کے حق میں ہیں اور حزب اختلاف کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے اپنا منشور پیش کرنے اور حکومت کے بارے میں اپنی آراء ظاہر کرنے کے لیے انتہائی محدود رسائی دی جاتی ہے[4]۔

حکومت پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ جب سیاسی پارٹیاں رجسٹریشن کے لیے آتی ہیں تو حکومت ان میں سے محض چند پارٹیوں کی تشکیل کی اجازت دیتی ہے۔ زیادہ تر پارٹیوں کی رجسٹریشن مسترد کر دی جاتی ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ بغیر کسی ثبوت کے کسی کو گرفتار کر کے قید کر لینا حقوق انسانی کے سخت منافی ہے[5] اور اس ضمن میں سابق وزیر اعظم انور ابراہیم کے ساتھ ہونے والا سلوک انتہائی تشویش ناک مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے[6]۔

المختصر ملائشیا میں جمہوریت کے ضمن میں قابل غور اقدامات کیے گئے ہیں جن کی رو سے انتخابی عمل کے انعقاد کے لیے مناسب حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ البتہ آزاد جمہوریت کے ضمن میں ملائشیا کئی الزامات کا سامنا کر رہا ہے البتہ آزاد جمہوریت کی جانب تاحال مثبت اقدامات نظر آ رہے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں سے اب تک ملائشیا کا سیاسی صورت حال:

---

1. Human Rights Commission of Malaysia, Annual Report, Kuala Lumpur, 2007, P: 8
2. Ibid, P:14
3. RS. Milne. *Malaysian Politics under Mahatir*. London , Routledge 1999, P: 105
4. Sanjeev Miglani, Malaysian Elections. Are They Fair? Reuters, Vol 6, March 2008
5. Suaram. *Civil and Political Rights Report of Malaysia*. Kula Lumpur Suaram 2008, P: 6
6. Rainer Heufers. *The Politics of Democracy Malaysia*. Journal of Asian, Vol 85. October 2002, P: 53

ملائیشیاء کی حکمرانی جب مہاتیر محمد کے ہاتھ آئی تو اس وقت ملائیشیا کی معاشی حالت بہت ابتر تھی، ان کی معیشت کا انحصار مکمل طور پر زراعت اور سمال انڈسٹریز پر تھا- لیکن مہاتیر محمد نے آکر معاشی میدان میں وہ تبدیلیاں کیں کہ جس سے ان کا معاشی ڈھانچہ تبدیل ہو گیا اور ملائیشیا تھوڑے ہی عرصے میں اقوام عالم کی توجہ کا مرکز بن گیا- بنیادی مسئلہ ملائیشیا کی دو بڑی اقوام ملائی اور چینیوں کی نا اتفاقی تھا- ملائیشیا نسلی اور علاقائی گروہ بندی کا شکار تھا- مہاتیر محمد نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے ان گروہ بندیوں کو ختم کیا اور تمام اقوام کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر ان کو ریاست کے مرکزی نقطے پر اکھٹا کیا- ان نے دوسرے ممالک کے ساتھ مل کر ملک میں صنعت و حرفت کو مضبوط کیا- مہاتیر محمد 2003ء میں ریٹائر ہو گئے- وہ 15 سال کا عرصہ حکومت سے دور رہے لیکن سماجی سطح پر وہ عوام سے دور نہیں ہوئے-

2003ء سے 2018ء تک برسر اقتدار رہنے والے لوگوں نے ملائیشیا کی عوام کی توقعات کو پورا نہ کیا- جس میں افراطِ زر کی شرح میں کمی، بے روزگاری، سول ٹیکسیز کے نفاذ کے علاوہ کرپشن اور منی لانڈرنگ کے واقعات رونما ہوئے- بالخصوص ملائشیا کے ابھی سبکدوش ہونے والے وزیرِ اعظم کرپشن اور بد عُنوانی میں معروف تھے اور اس وجہ سے پورا ملک کرپشن کی لپیٹ میں آتا جا رہا تھا؛ یہ اور اس طرح کے کئی دیگر الزامات کی وجہ سے حکمران طبقہ عوام کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہا- اور ایک بار پھر 9 مئی 2018ء کو انہوں نے 92 سالہ ڈاکٹر مہاتیر محمد کو اپنا ساتواں وزیر اعظم منتخب کیا- مہاتیر محمد کو جدید ملائیشیا کا معمار کہا جاتا ہے- اس سے بڑھ کر ان کی شخصیت اور قیادت کی خوبی اس دفعہ کے الیکشن میں یہ دیکھنے کو ملی کہ مہاتیر محمد نے اپنی سیاسی پارٹی کو چھوڑ کر اپوزیشن جماعت کی طرف سے انتخاب لڑا اور 222 میں سے 115 نشستیں جیت کر واضح کامیابی حاصل کی- دلچسپ بات یہ کہ وہ پارٹی جو 60 سال سے ملائیشیا پر حکمرانی کر رہی تھی ایک مہاتیر محمد کی قیادت کے تبدیل ہونے سے اس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔[1]

ترکی

اسلام پسندوں کو دبانے کے لیے استعمال کیے گئے تمام ہتھکنڈوں کے باوجود ترکی میں ان کی قوت بڑھتی چلی آرہی ہے اور 1995ء کے انتخابات میں پہلی بار اسلام پسند رفاہ پارٹی سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھری اور واضح اسلامی نقطۂ نظر رکھنے والے نجم الدین اربکان ترکی کے وزیر اعظم بنے۔ رفاہ پارٹی کے اسلام پسند نظریات کے بعد قومی سلامتی کونسل کے ساتھ ان کے تعلقات میں بدمزگیاں پیدا ہو گئیں۔ یہ اندیشے بھی سر اٹھانے لگے کہ کہیں

1 فیصل الرحمن، "ملائشیا کی سیاسی تبدیلی" مرآۃ العارفین انٹرنیشنل، جون 2018ء

https://www.mirrat.com/article/11/420

نئ حکومت ترکی کے لادین نظام اور مغرب کی طرف التفات کی پالیسی کو تباہ ہی نہ کر دے۔ آخر کار قومی سلامتی کونسل کے دباؤ میں آکر جون 1997ء میں اربکان کو مستعفی ہونا پڑا اور ان پر عمر بھر کے لیے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس کے باعث ہونے والی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کا سب سے زیادہ فائدہ بلند ایجوت کی جمہوری بائیں پارٹی کو ہوا اور انہوں نے پہلے مادر وطن پارٹی اور آگے چل کے راہ حق پارٹی کے ساتھ اتحادی حکومتی بنائی۔

18 اپریل 1999ء کو ہونے والے قومی اور بلدیاتی انتخابات کے نتیجے میں جمہوری بائیں پارٹی، مادر وطن پارٹی اور دیولت باہ چلی کی قوم پرست ایکشن پارٹی کے اتحاد نے حکومت بنائی جس میں بلند ایجوت ہی بدستور وزیر اعظم رہے۔ ترکی کی آئینی عدالت (سپریم کورٹ) کے سابق سربراہ احمد نجدت سیزر کو 5 مئی 2000ء کو ترکی کا صدر منتخب کیا گیا۔ انہوں نے 16 مئی کو اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔

اس حکومت نے پہلے ہی برس آئینی و اقتصادی اصلاحات کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس میں وہ نکات بالخصوص شامل تھے جن کے باعث یورپی اتحاد میں ترکی کی رکنیت کے امکانات بہتر ہو جاتے لیکن ان اصلاحات کو عملی شکل دینے کے بارے میں حکومت کی صلاحیت سے متعلق شکوک کے ساتھ ساتھ ایک اقتصادی جعل سازی کے باعث فروری 2001ء میں ترکی ایک اقتصادی بحران میں پھنس گیا۔ جیسے جیسے یہ بحران سخت ہوتا گیا، کھلے بازار میں ترک لیرا کی فروخت بڑھ گئی۔ جس کے باعث حکومت کو لیرا کی قیمت میں 40 فیصد تک کمی کرنا پڑی ساتھ ہی سود کی شرح اور اشیائے صرف کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا اور روزگار کے مواقع بھی کم ہونے لگے۔ اس بحران کا اثر جن دیگر معاملات پر پڑا ان میں اقتصادی استحکام کے لیے بلند ایجوت حکومت کے بے نظیر اقدامات اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے 11 ارب ڈالر کے قرض کی مدد سے چلنے والا مہنگائی توڑ پروگرام سر فہرست تھے۔

ان حالات سے نمٹنے کے لیے وزیر اعظم نے عالمی بینک کے ایک سابق نائب صدر کمال درویش کو مارچ 2001ء میں وزیر اقتصادیات مقرر کیا۔ متعدد اقتصادی و عملی اصطلاحات اور نچلی سطح پر اقتصادی استحکام اور میزانیہ سازی میں حکومت کو سہارا دینے کے لیے انہوں نے مئی 2001ء تک مجموعی طور پر بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے 10 ارب ڈالرز کے قرضوں کا انتظام کیا۔ فروری 2002ء میں عالمی مالیاتی فنڈ نے 9 ارب ڈالرز کے مزید قرضے منظور کر دیئے اور اس شرط پر سال بھر کے دوران چند قسطوں پر مشتمل مزید 5 ارب ڈالرز کا وعدہ بھی کیا کہ ترکی اپنی اقتصادی اصطلاحات ان کے مشوروں کی روشنی میں مرتب کرے گا۔

تاہم حکومتی اتحاد میں کشیدگی چلتی رہی۔ عالمی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) کی شرائط (بالخصوص سرکاری اداروں کی نجکاری) اور سیاسی اصطلاحات کی سست روی تنازعات کی بڑی وجوہ تھیں۔ مئی 2002ء میں خرابی صحت کے

آثار سامنے آنا شروع ہونے کے باوجود بلند ایجوت کے مستعفی نہ ہونے کے باعث وزیر اعظم کی اپنی جمہوری بائیں پارٹی کے 60 ارکان اسمبلی، نائب وزیر اعظم اور وزیر خزانہ سمیت کئی وزراء نے بھی استعفے دے دیے۔

ان استعفوں کے ساتھ ساتھ حزب اختلاف کی دونوں جماعتوں اور حکومتی اتحاد میں شامل دیگر جماعتوں کی طرف سے دباؤ کے نتیجے میں ترک پارلیمان کو مقررہ وقت سے 18 ماہ قبل 3 نومبر 2002ء کو نئے انتخابات کرانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

موجودہ ترک صدر رجب طیب اردوغان ان مالیاتی گھپلوں، نظم و نسق میں کمزوری اور بد عنوانی کے باعث سیکولر طبقوں کی ساکھ شدید متاثر ہوئی۔ ان کے مقابلے میں مقامی بلدیاتی انتخابات میں فتوحات حاصل کرنے والی اسلام پسند قوتیں انتہائی ایمانداری کے ساتھ اپنا کام کر رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ رفاہ پارٹی کے بعد ان سے نکلنے والا ایک دھڑا عدالت و ترقی پارٹی نمایاں ہو کر سامنے آیا اور اس نے مسلسل دو انتخابات جیت کر اب تک دائیں بازوں کی سب سے بھرپور قوت کے طور پر ابھری ہے۔ 2002ء اور 2007ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے والی عدالت و ترقی پارٹی نے آخری انتخابات میں سادہ اکثریت حاصل کر لی۔ اِس وقت رجب طیب اردوغان صدر ہیں، جن کی بیگم سر ڈھانپتی ہیں۔

2002ء کے انتخابات کے موقع پر انصاف و ترقی پارٹی کے سربراہ رجب طیب اردوغان کو 1998ء میں اپنی کسی تقریر میں اسلام کے حق میں کلمات ادا کرنے کے باعث انتخابات و وزارت عظمی کے لیے نااہل قرار دیا گیا نتیجتا ان کی جگہ ان کے نائب عبد اللہ گل وزیر اعظم بنائے گئے تاہم بعد میں ایک آئینی ترمیم کے ذریعے اس پابندی اور اس کی وجہ سے ہونے والی سزا کو ختم کر دیا گیا۔ 9 مارچ کو ایک ضمنی انتخاب کے ذریعے اردوغان پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے اور ان کو حکومت میں لانے کی خاطر عبد اللہ گل وزارت عظمی سے دستبردار ہو گئے۔ انہیں بعد ازاں پہلے دور میں وزیر خارجہ اور دوسرے دور حکومت میں صدر جمہوریہ کا عہدہ دیا گیا۔

انصاف و ترقی پارٹی کے پہلے دور اقتدار میں جنگ عراق شروع ہو گئی۔ پارلیمان نے امریکہ کے اتحادی ممالک کی افواج کے دستوں کو ترکی سے گذرنے کی اجازت نہیں دی البتہ اپنے دستے بھیجنے کی منظوری دے دی لیکن امریکہ اور ترکی بعد میں اس بات پر متفق ہو گئے کہ ترکی کی اس پیشکش سے فائدہ نہیں اٹھایا جائے گا۔

انصاف و ترقی پارٹی کے سیاسی مقاصد کی فہرست میں عراق، کردستان، یورپی اتحاد کی رکنیت، مسئلہ قبرص اور معیشت کی بہتری زیادہ نمایاں نکات ہیں۔ مارچ 2004ء میں انصاف و ترقی پارٹی نے بلدیاتی انتخابات میں 42 فیصد ووٹ حاصل کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی۔ نومبر 2007ء میں ہونے والے دوسرے انتخابات میں انصاف و ترقی پارٹی نے سادہ ترین اکثریت حاصل کر لی اور بغیر کسی جماعت سے اتحاد کے حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس دور میں سابق وزیر خارجہ عبد اللہ گل کو صدارت کا عہدہ دیا گیا۔ اگست 2014ء سے رجب طیب اردوغان ترکی کے 12ویں صدر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔[1]

ترکی میں پارلیمانی نظامِ حکومت رائج ہے جس کے مطابق وزیر اعظم کو حکومت کا سربراہ تسلیم کیا جاتا ہے۔1946ء سے تا حال ترکی میں تقریباً پندرہ انتخابات منعقد ہو چکے ہیں اور تقریباً بیس سیاسی پارٹیاں ان میں شمولیت اختیار کر چکی ہیں جن کے ہزاروں امیدوار سملی سیاست کا حصہ بن چکے ہیں[2]۔

سیاسی جماعتوں کو ذرائع ابلاغ تک آزادانہ رسائی دی گئی ہے جس کی وجہ سے اب تک ترکی کے سیاسی انتخابات میں دھاندلی کا کوئی الزام سامنے نہیں آسکا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ترکی میں انتخابات کی شفافیت پر شک وشبہے کی بہت کم گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔

ترکی کے سیاسی اور حکومتی نظام میں ترک افواج نے چار مرتبہ دخل اندازی کی ہے جن میں سے تین مرتبہ براہ راست حکومت کو اپنے ہاتھ میں لیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان واقعات کو عوام الناس کے سیاسی حقوق پر ڈاکہ تصور کیا جاتا ہے۔ مئی 2004ء میں ایک قانونی ترمیم کے بعد افواج کو حکومتی امور سے بتدریج بے دخل کر دیا گیا تھا اور ترکی کی قومی حفاظتی کونسل "National Security Council" جس میں افواج کے پانچ نمائندے شامل ہوتے ہیں، کو بھی اب محض مشاورتی ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ ترک حکومتوں پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ انہوں نے قانون کی شق نمبر 301 کو اپنے مفادات کے لیے بار بار استعمال کیا ہے۔اس قانون کے مطابق عوام الناس میں سے ان لوگوں کو قانونی سزا دینے کی اجازت دی گئی ہے جو ملی امور کے حساس معاملات کے بارے میں تحریری یا زبانی گفتگو کرتے ہیں[3]۔

1999 کے بعد ترکی نے حقوق انسانی سے متعلق قانون سازی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور کئی دستوری اصلاحات متعارف کروائی ہیں۔ ان میں سے ایک اہم اصلاح یہ ہے کہ حکومتی اداروں میں اقلیتوں کی نمائندگی کے لیے اقلیتی برابری سے متعدد افراد کا انتخاب کر کے ان کو سیاسی ایوانوں تک رسائل دی گئی ہے[4]۔

افواج کی دخل اندازی کے باوجود ترکی میں جمہوریت پسندی کو فروغ ملا ہے اور ہر انتخاب کے بعد پر امن طریقے سے اقتدار کی منتقلی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی نے جمہوری اقدار کا بھرپور طریقے سے نہ صرف اطلاق کیا ہے بلکہ ان اقدار کا دفاع بھی کیا ہے۔

1-"ترکی مغربی ایشیا کا ملک جس کا کچھ حصہ شمال میں یورپ میں واقع ہے" آزاد دائرۃ المعارف، ویکیپیڈیا

https://ur.m.wikipedia.org/wiki/%D8%AA%D8%B1%DA%A9%DB%8C

2. Cengiz Candar. *Redefining Turkey's Political center*. Journal of Democracy, October: 99, 129

3. Reporters Without Borders, Paris, 2007)

4. Huseyin Alaz, what is being done on Human Rights and Democracy in Turkey, The World Movement on Democracy, World Movement of Democracy, Istanbul, 2006

مصر

آزادی کے بعد مصر میں 1952 تک بادشاہت قائم رہی اور اس کے بعد جمال عبد الناصر نے فوج کے ذریعے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مصر میں ایک مضبوط صدارتی نظام رائج ہو گیا تھا جو تا حال جاری ہے۔ سیاسی انتخابات کو آزادانہ صورت دینے کے بجائے وزارت داخلہ کو ان کا نگران بنا دیا گیا تھا البتہ ان کا انعقاد باقاعدہ ہوتا رہا ہے۔ ان انتخابات کو دو تہائی اکثریت کے ساتھ مسلسل National Democratic Party جیتتی رہی ہے۔ ہر مرتبہ مصری انتخابات پر دھاندلی کا الزام لگتا رہا ہے اور حزب اختلاف نے کبھی بھی ان کے نتائج پر اتفاق نہیں کیا ہے[1]۔

قومی سطح پر ہونے والے انتخابات کی طرح علاقائی انتخابات میں بھی یہی ماحول نظر آیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ 2008ء میں بیس فیصد حکومتی امیدواروں نے انتخاب جیت لیے تھے کیونکہ حزب اختلاف کے اسی فیصد امیدواروں کو انتخاب میں ناکام کرنے کے لیے ان پر سیاسی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں[2]۔ 1982ء کے بعد انتخابات میں عمل دخل کی بنا پر ہی حسنی مبارک چھ مرتبہ مصر کے صدر رہ چکے ہیں۔ ان پر ہر مرتبہ یہی الزام عائد ہوا ہے کہ انہوں نے سیاسی انتخابات میں اپنی طاقت کے استعمال کے ذریعے دھاندلی کا ارتکاب کیا ہے[3]۔

حالانکہ مصر میں کثیر التعداد سیاسی جماعتیں متحرک رہی ہیں لیکن ان کے باوجود نئی سیاسی جماعت کی تشکیل پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کی جا چکی ہیں[4]۔ مثال کے طور پر حکومتی جماعت کے اراکین کو قومی ذرائع ابلاغ تک آزادانہ رسائی دی جاتی ہے لیکن حزب اختلاف کے نمائندوں کے پاس یہ آزادی انتہائی محدود ہے[5]۔ مزدوروں کو اپنی اپنی انجمن بنانے کی اجازت دی گئی ہے لیکن ان انجمنوں پر ریاست کی جانب سے گوناں گوں پابندیاں بھی عائد کی جاتی ہیں۔ 2005 میں حقوق انسانی کے کمیشن نے اور 2006 میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق مصر میں سیاسی افراد کو قید و بند اور تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور عام لوگ بھی اگر سیاست میں دخل اندازی کریں تو ان کو بھی تشدد اور موت کی سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے[6]۔

المختصر سخت صدارتی حکومت، مشکوک انتخابات، سیاسی نظام پر حکومتی گروہ کا مکمل استحصال اور ریاستی سطح پر مسلسل ہنگامی حالات کا طاری رہنا مصر کی سیاست کے تشویش ناک پہلوؤں میں سے ایک ہے۔ اس کے نتیجے میں مصر کو جمہوری سیاست کی پیروی کرنے والا ملک قرار دینے میں متعدد مسائل درپیش ہو سکتے ہیں۔

---

1. Anzia Ayyubid. *Over- Stating the Arab State*. London: I.B Tauris Press 1995, P: 417-421
2. Issaka Souaré, Egypt, the Political Process between Opening Up and Control, Situation Report, 9 April 2008 by Institute of Security Studies, South, Institute of Security Studies, Pretoria, Africa, P. 1
3. Amr Hamzawy. *Opposition in Egypt in Policy Outlook*. Carnegie Endowment for Peace, Washington, 2005, P:1
4. Ibid, P: 227
5.Ibid, p: 227
6. Freedom House, Egypt, Annual Country Report, Freedom House, Washington, 2007

مصر مختلف سیاسی ادوار:

16ویں صدی تا20ویں صدی کے آغاز تک مصر پر بیرونی طاقتوں کے حکومت کی۔ شروع میں سلطنت عثمانیہ اور بعد میں سلطنت برطانیہ نے مصر کو اپنی حکومت کا حصہ بنایا۔ جدید مصر کا آغاز 1922ء سے ہوا جب مصر کو برطانیہ سے آزادی ملی مگر آزادی کے بعد وہاں بادشاہت قائم ہوگئی۔ البتہ اب بھی وہاں برطانوی فرج کا غلبہ تھا اور کئی مصریوں کا کہنا ہے کہ بادشاہت دراصل برطانیہ کی ایک چال تھی تاکہ مصر ان کی کالونی کا حصہ بنا رہے۔ مصری انقلاب، 1952ء میں مصریوں نے برطانوی فوج اور افسروں کو اپنے ملک سے بھگا دیا اور اس طرح مصر سے برطانیہ کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ برطانوی نہر سوئز کا قومیانہ کیا گیا اور شاہ فاروق اول کو مع اہل خانہ ملک بدر کر دیا گیا۔ اس طرح مصر ایک جمہوری ملک بن گیا۔ 1958ء میں جمہوریہ سوریہ کے ساتھ مل کر متحدہ عرب جمہوریہ کی بنیاد ڈالی گئی مگر 1961ء میں اسے تحلیل کرنا پڑا۔ 20ویں صدی کے نصف آخر میں مصر میں سماجی اور مذہبی اتار چڑھاو دیکھنے کو ملا جس کی وجہ سیاسی عدم استحکام کی صورت حال پیدا ہو گئی اور اسی دوران میں 1948ء میں اسرائیل کے ساتھ تنازع، 1956ء میں سوئز بحران، 1967ء میں روزہ جنگ اور 1973ء میں جنگ یوم کپور جیسے ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے۔ مصر نے 1967ء تک غزہ پٹی پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ 1978ء میں مصر نے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ پر دستخط کیے اور غزہ پٹی سے اپنا قبضہ واپس لے لیا اور ساتھ اسرائیل کو ایک ملک کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ ملک میں بدستور سیاسی ہنگامہ جاری رہا اور بے امنی کو دور دورہ رہا۔ 2011ء میں پھر ایک انقلاب برپا ہوا اور مصر کی سیاست میں زبردست تبدیلی آئی۔ اسی دوران مصر دہشت گردی کی زد میں رہا اور معاشی مسائل سے بھی دوچار رہا۔ مصر کی موجودہ حکومت بین صدارتی جمہوریہ ہے اور مصر کے موجودہ صدر عبدالفتاح السیسی ہیں۔ سیاست میں انہیں آمریت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔[1]

مشرق وسطیٰ اور عرب ممالک

عرب میں 19 ریاستیں شامل ہیں جو ایشیاء اور افریقہ میں واقع ہیں۔ ان ممالک کے مختلف تہذیبی اور ثقافتی پسِ منظر کی وجہ سے ان کے معاشی اور سیاسی حالات میں ایک دوسرے سے مختلف منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس مکمل خطے کو جمہوریت کی مثالیت کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ سیاسی آزادی کے تناظر میں انسانی حقوق، سیاسی آزادی اور جمہوری مشقوں کے حوالے سے مشرق وسطیٰ کو ایک استثنائی خطہ قرار دیا جا سکتا ہے[2] عمومی طور پر یہ خطہ مخصوص خاندانوں کے زیر اقتدار ہے جن کے اسالیبِ حکومت ایک دوسرے کے ساتھ جزوی طور پر موافق اور

---

1 "مصر براعظم افریقا کا اسلامی ملک"، ویکیپیڈیا

https://ur.m.wikipedia.org/wiki/%D9%85%D8%B5%D8%B1

2. G Salame. *Democracy Without Democrats*. London : IB Tauris Press 1994, P: 23

مختلف ہیں۔ مثلاً ان میں سے زیادہ تر ممالک ایسے بادشاہوں کے زیر اثر ہیں جنہوں نے حالات و واقعات کے مطابق اپنے شاہی اصولوں میں تغیر اور تنوع پیدا کیا ہے۔ سعودی عرب اس کی ایک مثال ہے جہاں کوئی حزبِ اختلاف نہیں ہے، کوئی باقاعدہ قانون سازی نہیں ہے اور نہ ہی وہاں تحریری قانون کا کوئی مسودہ ہے[1]۔ کچھ بادشاہتیں کسی حد تک آزادی پسند ہیں جن میں عمان، مراکش، بحرین، کویت اور اردن وغیرہ شامل ہیں۔ ان ممالک میں حکمرانوں نے انتخابات اور قانون سازی کے عمل کے ضمن میں نمایاں اقدامات کیے ہیں۔ مراکش میں کثیر الجماعتی سیاسی انتخابات کی تاریخ عرب ممالک میں سب سے زیادہ طویل ہے۔ لیکن جب بادشاہ کے اقربا کے ہار جانے کا خدشہ ہوتا ہے تب بادشاہ اپنے خصوصی فرمان کے ذریعے انتخابات کے عمل کو تحلیل کر دیتا ہے[2]۔ اس لیے جب تک عملی قوت اور اقتدار کسی حکومتی طبقہ کے پاس ہو تب تلک ایسے بوجھل اور دھاندلی زدہ عمل سے جمہوریت کی ترویج و ترقی کا کوئی سامان نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے عرب حکمرانوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی سیاسی حکمت عملی میں جتنی بھی لچک پیدا کر لیں، وہ کبھی بھی اپنی ذاتی خود مختاری پر سمجھوتہ کرنے کی جانب گامزن نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے عرب ممالک بھی موجود ہیں جن میں پارلیمانی نظام رائج ہے لیکن وہاں بھی محض ایک ہی سیاسی جماعت ہونے کی بنا پر ووٹر کو اپنی رائے دینے کے عمل میں کسی انتخابی راستے کو اختیار کرنے کی صورت منظر نہیں آتی ہے۔ ان ریاستوں میں شام اور لیبیا شامل ہیں۔ کچھ عرب ممالک میں زیادہ سیاسی پارٹیاں بھی موجود ہیں۔ ان میں یمن، مصر، الجزائر، سوڈان اور تیونس وغیرہ شامل ہیں۔ ان ممالک میں مقتدر طبقات اس قدر حاوی ہیں کہ ان سے اختلاف رکھنے والی جمہوری جماعتوں کا اقتدار میں آنا انتہائی مشکل دکھائی دیتا ہے[3]۔

لبنان اور فلسطین جیسے عرب ممالک میں کثیر الجماعتی جمہوری نظام رائج ہے جن کی بنا پر وہاں شفاف انتخابات کا انعقاد ہوتا ہے۔ جمہوری نظام پر کلی طور پر عمل نہ کرنے کے باوجود تمام عرب ممالک کے مغربی دنیا کے ساتھ دوستانہ مراسم ہیں جب کہ ایران جیسا ملک جس میں جمہوری آزادی کو یقینی بنائے جانے کی کوشش کی جاتی ہے، مغرب کی جانب سے ہمہ وقت سخت تنقید کا نشانہ بنتا رہتا ہے۔

وسطی ایشیاء

وسطی ایشیاء کے ممالک کو روس سے آزادی ملنے کے بعد خود مختار حکمرانوں نے چلایا ہے۔ ان ممالک میں جمہوریت کے حوالے سے انتہائی کم پیش رفت ہوئی ہے۔ اس کے باوجود ان ممالک میں سے قازقستان نے جمہوری

1. Nazih N Ayubi. *Islam and Democracy*. David Goldblatt and others Pub Polity Press, Cambridge, 1997, P: 356
2. Rein Talebear. *Prospects for Democracy in Muslim Countries*. California: Centre for the Study of Democracy 2003, P: 5
3. Alfred Stepan. *An Arab More than Muslim Electorate*. Journal of Democracy, Vol 14, July 2003, P: 39

اقدار کو اپنانے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن وہاں قانون سازی کا عمل مکمل طور پر حکومتی طبقے کے ماتحت ہے[1]۔ اسی لیے ان ریاستوں کو جمہوری اقدار سے قدرے خالی پایا جاتا ہے۔

جنوبی اور مشرقی جنوبی ایشیاء

اس خطے میں تین اہم مسلمان ممالک انڈونیشیا، پاکستان اور بنگلہ دیش واقع ہیں۔ ان ممالک میں جمہوریت، قانون سازی اور دساتیر موجود ہیں اس کے باوجود یہاں جمہوری اقدار کی عملی تصویر کلی طور پر نظر نہیں آتی ہے[2]۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک میں جمہوری نظام کو دوسرے مرحلے پر رکھنے کی بنیادی ذمہ داری ان کی افواج پر عائد ہوتی ہے۔ ان افواج نے تاریخ کے کئی مراحل میں جمہوریت کو سبوتاژ کرتے ہوئے حکومت پر قبضہ جمایا ہے۔ اگرچہ ان ممالک میں اب مثبت علامات نظر آرہی ہیں لیکن عملی طور پر جمہوریت کی عمل داری انتہائی سست روی کا شکار ہے۔

مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ممالک میں جمہوریت اپنی کمزور حالت میں موجود ہے اور اس کی حالیہ لہریں بھی قابلِ غور اثرات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں[3]۔ مسلمان دنیا میں جمہوریت کے ضمن میں چار گروہوں کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

1. ترکی اور ملائشیا میں جمہوری اقدار کی عمل صورت نظر آتی ہے۔
2. پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈونیشیا جیسے ممالک میں جمہوریت جزوی طور پر سیاسی امور میں کارفرما نظر آتی ہے۔ البتہ ان کے ہاں افواج کی دخل انداز جمہوری عمل کو معطل کرنے کا باعث بنتی ہے۔
3. مراکش، بحرین، اردن اور کویت ایسے ممالک خود مختار حکمرانوں یا بادشاہوں کے زیر اقتدار چل رہے ہیں۔ یہ حکمران عوام کو آزاد سیاسی ماحول دینے پر رضامند تو ہوسکتے ہیں لیکن اس ضمن میں وہ یہ کبھی بھی نہیں چاہتے کہ ان کی ذاتی خود مختاری پر آنچ آئے۔
4. سعودی عرب جیسے ممالک بھی مسلمان دنیا میں موجود ہیں جو بادشاہت کا نظام قائم رکھنا چاہتے ہیں اور ان کے ہاں جمہوریت پسندی کو پذیرائی نہیں دی جاسکتی ہے۔

---

1. Natalia Zotova. *Evolution of Political Regimes in Central Asia*. Moscow: Ferghana Rus Information Agency 07 March, 2007
2. Vali Nasr. *The Rise of Muslim Democracies*. Journal of Democracy, Vol 16, April 2005, P: 14. 33
3. David Potter. *Explaining Democratization*. Cambridge: Polity Press 1997, P: 9.

باب دوم

اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو اور مولانا مودودی کے افکار

فصل اول: اسلامی ریاست اور تصورِ قومیت

فصل دوم: اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیادیں

فصل سوم: اسلامی ریاست کا انتظامی ڈھانچہ

فصل اول

اسلامی ریاست اور تصور قومیت

سید مودودیؒ کے افکار کی روشنی میں

قومیت کا مسئلہ چونکہ اپنی حساسیت کے اعتبار سے اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس سے متعلق سید مودودیؒ کے افکار و آراء پیش کرنے سے قبل قومیت کے تاریخی پسِ منظر کو بیان کیا جائے تاکہ سید مودودیؒ کے موقف کو بہتر انداز میں سمجھا جاسکے۔

قومیت کا مفہوم

عربی زبان میں قومیت کا مادہ "ق۔و۔م" ہے۔ لغت میں اس کا مفہوم "لسانی، وطنی یا مذہبی رشتہ ہے جس کی بنا پر لوگوں میں مخصوص اتحاد کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اس اتحاد میں جذباتیت کا دخل زیادہ ہوتا ہے[1]۔ قوم کا ایک معنٰی افراد کا گروہ ہے۔ عربی زبان میں اس کی جمع اقوام ہے۔ وہ شخص جو قومیت کے نظریے کا پیروکار ہو اس کو "القومی" کہا جاتا ہے[2]۔

اردو زبان میں قوم سے مراد نسل، ذات، خانوادہ، خاندان، فرقہ اور آدمیوں کا گروہ ہے۔ یہ لفظ اسم مؤنث ہے اور اس کے معانی میں نسل، مذہبی تعلق اور ذات ہیں[3]۔ قومیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ وطن، مذہب اور امت کی بنا پر بننے والا احساسِ تشخص قومیت کہلاتا ہے[4]۔

قوم کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار سے گزر کر مضبوط ہونے والا انسانوں کا گروہ جس کی زبان، زمین اور معاش مشترک ہو نیز اس گروہ کے انسانوں کی نفسیات کی ساخت بھی مماثل ہو[5]۔

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے قوم کی تعریف کے ضمن میں لکھا ہے کہ جب انسان وحشی پن سے مدنیت کی جانب پہلا قدم اٹھاتا ہے تو اس کی کثیر طبقہ بندی کو وحدت میں ڈھال دیا جاتا ہے۔ یوں سب کے مقاصد اور اغراض اشتراک عمل سے مل جل کر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ جوں جوں تمدن میں ترقی آتی ہے، اس انسانی

1۔ وحید الزمان قاسمی، القاموس الوحید، (ادارہ اسلامیات، لاہور، 2001ء)، ص1370، 1371

2۔ لوئیس معلوف، المنجد، (خزینہ علم وادب، لاہور)، ص730

3۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، (مکتبہ حسن سہیل لیمیٹڈ، لاہور)، 3/402

4۔ اردو لغت تاریخی اصول پر، وفاقی وزارت تعلیم، (اردو لغت بورڈ، کراچی، 1992ء)، 14/376

5۔ جوزف اسٹالین، قوم اور قومیت، مترجم: طفیل احمد خان، (نیا ادارہ، لاہور، س۔ن)، ص18-19

وحدت کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ایک وقت آنے پر انسانوں کی کثیر تعداد اس کا حصہ بن جاتی ہے۔ اسی کو "قوم" کہا جاتا ہے[1]۔

قومیت کے متعدد عناصر کا ہونا لازم نہیں ہے بلکہ کسی ایک نکتہ پر متحد ہونے کی صورت میں بھی انسانوں کے مابین قومیت کا تعلق استوار ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے جن عناصر کا ذکر کیا ہے ان میں نسلیت، وطنیت، زبان کا اشتراک، رنگ کا اشتراک، معاشی مقاصد کا اشتراک اور نظام حکومت کا اشتراک شامل ہے[2]۔

چنانچہ لغوی اعتبار سے لفظ قومیت کسی مخصوص جماعت یا گروہ کی عکاسی کرتا ہے اور اس میں کسی قوم کی رکنیت کا احساس شامل ہوتا ہے۔

مغرب کا تصورِ قومیت

سمتھ انتھونی، جیمز پال اور فن لیسن ایسے مغربی مفکرین کے مطابق قومیت ایک ایسی تحریک ہے جس کی بنیاد کسی مخصوص طبقے کے مفادات کے تحفظ کے تصور پر رکھی گئی ہے[3]۔ قومیت کسی بھی وطن کے باشندوں میں ان کی انفرادیت کے احساس کو پختہ کرنے کا طریقہ ہے۔ قومیت کے دعوے داروں کا مطالبہ ہے کہ ہر قوم کو آزادی اور خود مختاری ملنی چاہیے اور کسی دوسری قوم کی مداخلت بغیر اس کو اپنے امور کی انجام دہی میں آزاد رہنا چاہیے[4]۔ قومیت کا مقصد ثقافت، نسل، جغرافیائی خطہ، زبان، سیاسی تصورات، مذہب اور روایات کی بنا پر کسی سماج کے باسیوں کو ایک اکائی کی صورت میں معاشرتی رشتے میں مضبوطی کے ساتھ جوڑنا ہے[5]۔

روسی مفکر جوزف سٹالن نے قومیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے کہ:

1۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، مسئلہ قومیت، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 1941ء)، ص5

2۔ مسئلہ قومیت، ص6-7

3. Smith, Anthony. Nationalism: Theory, Ideology, History. Polity, 2010. pp. 9, 25–30

James, Paul (1996). Nation Formation: Towards a Theory of Abstract Community. London: Sage Publications.

4. Finlayson, Alan (2014). "5. Nationalism". Political Ideologies: An Introduction. Routledge. pp. 100–102.

5. Triandafyllidou, Anna (1998). "National Identity and the Other". Ethnic and Racial Studies. 21 (4): 593–612.

"قوم انسانوں کے ایک ایسے پائیدار گروہ کا نام ہے جس کے ارتقاء و عروج میں تاریخ نے ہاتھ بٹایا ہو۔ جس کے اندر اشتراکِ زبان، اشتراکِ ارض اور اشتراکِ معاش پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کی نفسیاتی ساخت بھی ایک ہی ہو[1]"۔

مغربی مفکرین کے ہاں صرف قومی اکائی ہی نہیں بلکہ اس اکائی میں مضبوطی کے ساتھ بندھ کر مشترکہ مفادات کے تحفظ کے لیے مخصوص طبقات کو ذہنی و عملی طور پر آمادہ کرنا بھی قومیت کی تحریک کا اہم ترین مقصد ہے[2]۔ قوم پرستی کی تحریک کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ قوم پرست طبقات کے روایتی اور ثقافتی اثاثوں کا تحفظ کیا جائے۔ قومی امور میں کسی بڑے مقصد کے حصول کے بعد قوم میں فخر و مباہات کا احساس پیدا کیا جائے۔ اسی کی بنیاد پر حب الوطنی کا جدید نظریہ قائم کیا گیا ہے[3]۔

تاریخ میں لوگ ہمیشہ سے اپنی روایات، علاقائی خود مختاری اور اپنے اوطان کے ساتھ جذباتی طور پر منسلک رہے ہیں لیکن وسیع پیمانے پر قومیت پرستی نے اٹھارہویں صدی سے پہلے اپنے قدم مضبوط نہیں کیے تھے[4]۔ قومیت کی اساس کو سمجھنے کے تین مناہج ہیں: پہلے منہج کو بدئیت / اولیت (perennialism/ Primordialism) کہا جاتا ہے جس کے مطابق انسان ہمیشہ اقوام میں منقسم رہا ہے اور اسی لیے قومیت ایک فطری چیز ہے۔ دوسرے منہج کو قومی علامت سازی: (Ethnosymbolism) کہا جاتا ہے جس کے مطابق انسانی قوم پرستی ایک مخصوص ارتقاء کے بعد عمل میں آئی ہے اور اس ارتقاء کو سمجھنے کے لیے قومی علامات، داستانیں اور روایات ممد و معاون ہیں۔ تیسرا منہج نظریہ جدیدیت: (Modernization theory) کہلاتا ہے جس کے مطابق قومیت جدید معاشرتی مسئلہ ہے اور یہ جدید معاشروں کے معاشی حالات کی مناسبت سے تشکیل پاتا ہے[5]۔

قوم کی متعدد تعریفات ہیں جن کی روشنی میں قومیت کی متنوع وضاحتیں سامنے آتی ہیں۔ نسلی قومیت کے مطابق ایک نسل، ثقافت اور وراثتی روایات سے تعلق رکھنے والے افراد ایک قوم کہلاتے ہیں۔ شہری قومیت کے مطابق ایک محدود خطے کی اقدار، اداروں اور شہریت رکھنے والے افراد ایک قوم ہیں۔ مغربی دنیا کے بعض طبقات نے تاریخی قومیت سے اس اعتبار سے انکار کر دیا ہے کہ تاریخ کے مختلف دھاروں میں ایک ساتھ رہنے والے متعدد طبقات

---

1 جوزف سٹالن، قوم اور قومیت، ص 13

2. Smith, Anthony. Nationalism: Theory, Ideology, History. Polity, 2010. pp. 9, 25–30

3. James, Paul (2006). Globalism, Nationalism, Tribalism: Bringing Theory Back In – Volume 2 of 3 Towards a Theory of Abstract Community. London: Sage Publications.

4. Kohn, Hans (2018). Nationalism. Encyclopedia Britannica.

5. Smith, Deanna (2007). Nationalism (2nd ed.). Cambridge: polity

کی معاشرتی اور سماجی روایات میں کسی قسم کی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ ان گروہوں نے ایک ساتھ رہنے کے باوجود مخصوص مواقع پر ایک دوسرے کا نہ صرف ساتھ چھوڑ دیا بلکہ حملہ کر کے اپنے ہی حلیف طبقات کو نقصان بھی پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے قومیت کی تعریف کو تشکیلِ نو کے عمل سے گزارنے پر زور دیا ہے۔ چنانچہ قومی پرچم، قومی علامات، قومی جھنڈے، قومی زبانیں اور قومی داستانیں جدید قومیت کے لیے انتہائی اہم عناصر قرار پاتے ہیں[1]۔

مغربی دنیا میں قومیت کو مثبت اور منفی، دونوں پیراؤں میں دیکھا جاتا ہے۔ یونانی انقلاب، آئرش انقلاب، اسرائیل کے قیام میں صیہونی قومیت اور روسی زوال وغیرہ کو مثبت انداز میں دیکھا جاتا ہے[2]۔ دوسری جانب اس متعصب قومیت کی مذمت کی جاتی ہے جس کی بدولت نازی جرمنی میں ہولوکاسٹ جیسے واقعات رونما ہوئے تھے[3]۔

امریکی فلسفی اور تاریخ دان Hans Kohn نے 1944ء میں دعویٰ کیا تھا کہ قومیت کی بنیاد سترہویں صدی میں رکھی گئی تھی[4]۔ بعض مغربی مفکرین نے اس کو اٹھارہویں صدی سے منسوب کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں امریکی اقوام نے اپنی آزادی کے لیے سپین کے خلاف بغاوت کی تھی، اسی صدی میں فرانسیسی انقلاب آیا تھا۔ اس بات پر مورخین اور فلسفیوں کا اتفاق ہے کہ قومیت کو منظم اور مرتب تحریک کے طور پر انیسویں صدی میں پنپنے کا موقع ملا تھا[5]۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قوم پرستی زمانہ قبل از تاریخ سے ہی انسان کے اندر موجود ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب "سیاست" میں واضح طور پر لکھا ہے کہ کچھ اقوام کو قدرت نے صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ ان کو غلام بنا کر رکھا جائے۔ ارسطو نے ان اقوام کو "وحشی" کہا ہے اور وحشی سے مراد غیر یونانی اقوام ہیں۔ اہلِ یونان کے مطابق غیر یونانیوں کے حقوق اور یونانیوں کے حقوق میں واضح فرق تھا۔ مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے زیر اثر یورپ کے کئی

---

1. Billig, Michael (1995). Banal Nationalism. London: Sage, p: 72.

2. Beissinger, Mark. Nationalist Mobilization and the Collapse of the Soviet State. Cambridge University Press, 2002. P:8

3. Pierre James (2001). The Murderous Paradise: German Nationalism and the Holocaust. Greenwood.

4. Kohn, Hans (1967) [1944]. The Idea of Nationalism: A Study in Its Origins and Background. Transaction Publishers. P: 1.

Gregorio F. Zaide (1965). World History. P: 274.

5. Calhoun, Craig (1993). "Nationalism and Ethnicity". Annual Review of Sociology. 19: 211–39

Zimmer, O. (2003). Nationalism in Europe, 1890–1940. Studies in European History. Palgrave Macmillan. P:15

ممالک کچھ عرصہ کے لیے قوم پرستی سے گریز کرتے رہے لیکن بعد میں اہل روم نے کئی اقوام کو طبقات میں تقسیم کر کے ان کو اپنا غلام بنا کر رکھا۔

سولہویں صدی میں پروٹسٹنٹ فرقے کی اٹھان نے مسیحی دنیا کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا جس سے مختلف اقوام جو ایک اکائی کی صورت اختیار کر چکی تھیں، علاقوں، رنگتوں، نسلوں اور زبانوں میں تقسیم ہو کر رہ گئیں۔ بعد میں اٹھنے والی تحریک تنویر کی بنا پر مغربی اقوام الگ الگ ہو کر مزید تقسیم ہو گئیں اور اس تقسیم کے نتیجے میں چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں۔ ہر قوم نے اپنی قومیت کی بنیاد پر ادب کی تشکیل کی اور ان کے مفادات نے ان کے ذہنوں کو مزید تنگ کر دیا۔ اس نئے تصورِ قومیت نے قبائلی عصبیت کی جگہ لے لی جس نے انسانوں کے مابین گروہی تقسیم کی بنیاد پر ایک نئی کشمکش شروع کر دی۔ مغربی قوم پرستی میں چار عناصر بنیادی کردار ادا کرتے ہیں:

1۔ جذبہ افتخار

مغرب میں اپنی قوم، نسل، رنگت، زبان اور روایات پر فکر کرنے اور دیگر اقوام کو ہیچ سمجھنے کے جذبے کو بہت پذیرائی ملی تھی جس کی بنا پر مختلف گروہوں میں مفاخرت اور موازنے کی فضا نے جنم لیا تھا۔ یہ فضا عصرِ حاضر میں بھی قائم ہے۔

2۔ جذبہ حمیت

حق اور انصاف کو بالائے طاق رکھ کر صرف اپنی قوم کی طرف داری کا جذبہ مغربی تصورِ قومیت کا ہی پیش خیمہ ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں لکھے جانے والے ناولوں، بننے والی فلموں کے ساتھ ساتھ عملی زندگی میں سیاسی پالیسیوں میں بھی اس حمیت کو دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔

3۔ جذبہ قومی تحفظ

اپنی روایات، زبان، مذہب اور علاقے کے تحفظ کا جذبہ مغربی قومیت کے فلسفہ میں روح ایسی اہمیت رکھتا ہے۔ تاریخ کا عمیق مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت سے شروع ہونے والا یہ نظریہ بعد میں جارحانہ اسلوب اختیار کرنے کے بعد دیگر اقوام پر چڑھ دوڑنے اور ان پر قبضہ کرنے پر منتج ہوتا ہے۔

4۔ طاقتور بننے کا جنون

قومی بنیادوں پر غرور اور تکبر کا احساس مغربی اقوام میں بہت بڑے پیمانے پر موجود ہے جس کی روشنی میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ دوسری اقوام میں اپنی تہذیب اور اپنی ثقافت کو مروج کیا جائے اور اس کے بعد ان اقوام کے قدرتی

اثاثوں پر قابض ہونے اور اپنے ممالک کو خوشحال بنانے کی طرف پیش قدمی کی جائے[1]۔ چنانچہ مغرب میں ایسے دعوے اور نعرے بھی ملتے ہیں جن کے مطابق:

- برطانیہ کا حق ہے کہ وہ حکومت کرے۔
- مذہب دراصل اٹلی ہی ہے۔
- سب سے بلند جرمنی ہے۔
- خدا کا اپنا ملک امریکہ ہے۔

جدید قومیت کی تشکیل کے عناصرِ ترکیبی

سید مودودیؒ قومیت کا عصرِ جدید کا مسئلہ قرار دینے والوں سے اختلاف کرتے ہوئے اس کو عہدِ قدیم میں بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ قومیت اور قوم جدید پیرائے میں عصر حاضر میں ہی استعمال ہو رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مزاج اتنا ہی پرانا ہے جتنا پرانا تمدن ہے۔ جس مفہوم میں آج کل قومیت اور قوم کا نام استعمال کیا جاتا ہے اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ یونان، روم، بابل اور مصر کی قدیم تہذیبوں میں بھی اسی طرح مروج تھی جس طرح اس عہد میں اٹلی، جرمنی، انگلستان اور فرانس میں مروج ہے۔

انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابتدائی مرحلے میں مخصوص گروہ کے لوگ اپنے مصالح و مفاد کی خاطر متحد ہونے کے لیے قومیت کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ بعد میں قومیت کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں عصبیت پیدا ہو جاتی ہے اور جوں جوں قومیت کا مزاج سخت ہوتا ہوں توں توں عصبیت بھی شدت اختیار کرتی جاتی ہے۔ جب بھی کچھ لوگ مشترکہ مفاد کی خاطر قومیت کا لبادہ اوڑھ لیں، یہ یقین کر لینا چاہیے کہ اب ان کے مطابق قومیت کے حصار میں موجود لوگ اور اس حصار سے باہر والے لوگ الگ الگ شناخت کے حامل ہیں۔

چنانچہ پھر اپنی قوم کے لوگوں کو غیر اقوام پر ترجیح دی جاتی ہے، اپنی قوم کے فرد کو غیر قوم کے مقابلے میں بہتر گمان کیا جاتا ہے۔ دوسری قوم کے ساتھ مفاد یا نقصان کے معاملے میں اگر اختلاف پیدا ہو جائے تو پھر اپنی قوم کے حق میں جدوجہد کی جاتی ہے اور غیر کے مفاد کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر دو اقوام میں صلح ہو جاتی ہے تو اس صلح کی بنیاد بھی قومی مفاد ہو گی، اسی طرح اگر دونوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے تو اس کا سبب بھی کسی قومی مفاد سے متعلق خطرے کا احساس ہو گا[2]۔

1- آزاد دائرۃ المعارف، وکیپیڈیا سے

Website
https://ur.wikipedia.org/wiki/

2۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص220-221

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا موقف ہے کہ دنیا میں بننے والی قوموں میں نسلیت، وطنیت، زبان، رنگ، معاشی مفادات کا اشتراک اور حکومت کا اشتراک موجود ہوتا ہے۔ سید مودودیؒ نے ان امور کو عناصر اصلیہ کا نام دیا ہے۔ ان چیزوں نے انسانوں کو مختلف خطوں میں متحد کیا ہے اور ان کے اتحاد کو قوت عطا کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسانوں کو سینکڑوں بلکہ ہزاروں حصوں میں تقسیم بھی کر دیا ہے۔ اس قومیت کی وجہ سے کسی ایک انسانی حصے کو نیست و نابود کرنا ممکن ہے لیکن اس کو دوسرے حصے میں تبدیل کرنا ناممکن ہے۔ اسی طرح ایک انسانی نسل دوسری انسانی نسل میں تبدیل ہونا گوارا نہیں کرتی ہے۔ ایک علاقے کی وطنیت کو دوسرے علاقے کی وطنیت کے ساتھ جوڑا نہیں جا سکتا ہے اور نہ ہی ایک خطے کی زبان بولنے والے دوسرے خطے کی زبان کو اپناتے ہیں۔ کوئی قوم اس وقت تک دوسری قوم کی معاشی اغراض کے لیے حرکت میں نہیں آتی ہے جب تک ان اغراض میں اپنا مقصد پورا ہوتا ہوا نظر نہ آئے۔ کوئی بھی سلطنت دوسری سلطنت کو اپنا سب کچھ سونپنے کو تیار نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے بظاہر اقوام عالم کے درمیان دوستی اور صلح نظر آ رہی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ان کے مابین مصالحت نہیں بلکہ مفادات کے اشتراک کی بنا پر موافقت پائی جاتی ہے۔ ان کی قومی عصبیت ان کو ایک دوسرے کے خلاف مسابقت، منافقت اور مزاحمت کی دائمی کشمکش میں مبتلا کر کے رکھتی ہے۔ اس کے نتیجے میں اقوام عالم میں سے بعض آپس کے تصادم کی بنا پر لڑ لڑ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ روئے زمین پر بد امنی، فساد اور فتنے کا ایک ایسا سرچشمہ نظر آتا ہے جس کو شیطان کا کامیاب ترین حربہ قرار دیا جا سکتا ہے[1]۔

معاصر قومی تصورات پر سید مودودیؒ کا محاکمہ

مسلمان مفکرین نے مغرب کے تصورِ قومیت پر کڑی تنقید کی ہے اور اس کے مقابلے میں اسلام کے تصورِ امت کو زیادہ پائیدار قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں مغربی تہذیب کے سب سے بڑے نقاد ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سر فہرست ہیں۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ:

> "قومیت کا اسلامی تصور اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراک زبان ہے نہ اشتراکیتِ وطن ہے اور نہ اشتراکیت اغراض و اقتصادیات ہے۔ اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں[2]"۔

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق جدید قومیت کا تصور انسانی زندگی کے لیے مندرجہ ذیل مفاسد پیدا کرتا ہے:

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص 223

2۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر اقبال، تصور قومیت اور پاکستان، (مکتبہ عالیہ لاہور، 1977ء)، ص 57

1۔انسانی طبقات میں منافرت

جدید قومیت کی بناپر انسانی مزاج میں جاہلانہ عصبیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ایک قوم سے تعلق رکھنے والا دوسری قوم سے محض اس لیے نفرت کرتا ہے کہ اس کی زبان، رنگ، نسل اور علاقائیت اس سے مختلف ہے۔ انسانوں میں حق اور صداقت کو تسلیم کرنے کا مادہ مفقود ہو جاتا ہے۔ کالا، گورے کی جانب سے تحقیر کا نشانہ بنتا ہے، ایشیائی، انگریز کی نفرت کا شکار بنتا ہے[1]۔ امریکہ میں اسی عصبیت کی بناپر سیاہ فام لوگوں کا قتل جائز قرار پایا، ان کو محلات میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا، وہ عام شاہراہوں کے استعمال کے مجاز نہ تھے، ان کو تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی اور وہ ووٹ دینے کا اختیار بھی نہیں رکھتے تھے۔ جرمن اور فرانسیسی ایک دوسرے سے نفرت میں انتہا تک پہنچ چکے تھے اور وہ ایک دوسرے کے محاسن کو کسی صورت تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ مہذب یورپ کے باسیوں کا قتل انتہائی وحشیانہ سمجھا جاتا ہے لیکن وہ دوسرے اقوام کے سروں پر ہزاروں فٹ کی بلندی سے بم برسائیں تو اس کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس قومی امتیاز نے انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا اندھیرا قائم کر رکھا ہے جس کی بناپر وہ عالمگیر اخلاقیات اور شرافت کے اصولوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔

2۔انسانی حقوق کا استحصال

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق جدید قومیت انسانی حقوق کا استحصال کرنے کا سبب بن رہی ہے۔ وہ یہاں ایک سوال کھڑا کرتے ہیں کہ "کیا انسان کے لیے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ نالائق، بدکار اور شریر آدمی کو ایک لائق، صالح اور نیک نفس آدمی پر صرف اس لیے ترجیح دے کہ پہلا ایک نسل میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا کسی اور نسل میں؟ سیاہی اور سفیدی، مشرقی اور مغربی، پہاڑی اور ہمواری، سلطنت کے اختلاف وغیرہ کا اخلاق اور قابلیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ عقل بھی اس فرق کو تسلیم نہیں کرتی ہے لیکن جدید قومیت کے پیروکاروں کے نزدیک اس معاملہ میں عقل اور منطق کی پیروی نہیں کی جاتی ہے[2]۔

3۔نسلیت کے تصور کی کمزوری

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق نسلیت کا تصور انتہائی کمزور ہے کیونکہ نسلوں کے مابین اشتراک ہوتا رہتا ہے اور کوئی ایک شخص بھی روئے زمین پر ایسا نہیں ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ پہلے انسان تک صرف ایک سرچشمے

1۔ سید مودودی نے یہاں پچونا لینڈ کے واٹو قبیلے کے سردار تشکیدی کی مثال پیش کی ہے۔ تشکیدی نے ایک ظالم اور بد اخلاق یورپین کو کوڑے مارنے کی سزا سنائی تو اس کو برطانوی شہریت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ بعد میں تشکیدی نے اس فیصلے کے بارے میں ندامت کا اظہار کیا اور عہد کیا کہ آئندہ وہ کسی یورپین کے مقدمے کا فیصلہ نہیں سنائے گا۔ (اسلامی ریاست، ص224)

2۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص225

سے نکلا ہے۔ اگر نسل کے اشتراک کی بنا پر ہی قومیت کو تشکیل دینا ضروری ہے تو پھر تمام انسانوں کو ان کے پہلے باپ اور پہلی ماں سے ملانے والے نسب کی بنا پر ایک اکائی تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد تمام لوگ ایک ہی اصل اور ایک ہی نسل کی طرف منسوب کیے جائیں گے۔ عصرِ حاضر میں جن لوگوں کو مختلف نسلوں کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے اگر ان کے نسب ناموں کا بھی بغور مطالعہ کیا جائے تو اوپر جا کر وہ باہم مل جاتے ہیں۔

4۔ علاقائیت کی بنیاد میں نقص

علاقائیت پر تنقید کرتے ہوئے سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ انسان زمین کے جس حصے پر پیدا ہوتا ہے اس کا رقبہ بمشکل ایک گز ہوتا ہے۔ اگر علاقائیت کی بنا پر وطنیت کا تعین ہو تو ہر شخص کا وطن وہی ایک گز زمین کا ٹکڑا بنے گا۔ لیکن اپنی وطنیت کے تعین کے لیے انسان بعد میں اس ایک گز زمین کے گرد سینکڑوں اور بسا اوقات ہزاروں کلو میٹر کی حد بنا لیتا ہے۔ یہ انسان کی تنگ نظری کی واضح دلیل ہے کیونکہ حقیقت میں پوری زمین ہی ہر انسان کا وطن ہے۔ زمین کے صحرا، پہاڑ، دریا اور زرخیز خطے اسی کے اپنے حصے ہیں اس لیے انسان کے پاس ایسا کوئی اختیار یا حق نہیں ہے جس کو استعمال کرتے ہوئے وہ ایک خاص خطہ میں قید رہتے ہوئے اپنی سوچ اور عمل کی وسعتوں کا قتل کر ڈالے[1]۔

5۔ لسانی قومیت کے نقصانات

زبان کی بنیاد پر انسانوں کو اقوام میں تقسیم کرنا بھی سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق انتہائی ناقص ہے کیونکہ زبان کا مقصد محض مافی الضمیر کا اظہار ہے۔ ایک ہی زبان کے بولنے والے لوگ آپس میں گفت و شنید میں آسانی محسوس کرتے ہیں لیکن زبان کے مشترک ہونے سے نظریات اور خیالات کا مشترک ہونا لازم نہیں ہے۔ ایک ہی بات دس الگ الگ زبانوں میں کی جا سکتی ہے اور دس زبانیں بولنے والے کسی ایک خیال پر متحد ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی زبان بولنے والے دس الگ الگ خیالات میں تقسیم بھی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے قومی وحدت کے لیے محض اشتراک زبان ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے اشتراکِ خیال بھی لازم ہے۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے ذاتی جوہر کی بنا پر بنتی ہے، اس کی زبان کی بنا پر نہیں بنتی ہے[2]۔

6۔ رنگت کی بنیاد پر قومیت کا تاریک پہلو

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص226

2۔ ایضاً، ص227

رنگت کی بنیاد پر قومیت سازی کے موقف کی بھی سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے سخت مخالفت کی ہے۔ ان کا موقف ہے انسان کے اس شرف کی بنیاد اس کے جسم کی رنگت نہیں ہے بلکہ اس کی روح اور اس کے نفس کا ناطقہ اس کے لیے عزت اور منقبت کا سبب ہے۔ انسان دودھ حاصل کرتے وقت بھینس کی کالی یا سپیدی رنگت کا لحاظ نہیں رکھتا ہے کیونکہ اس کا مقصد دودھ حاصل کرنا ہے، رنگت کے ساتھ اس کو کوئی سروکار نہیں ہے۔ دوسری جانب انسان کی عملی زندگی میں یہ تضاد بھی موجود ہے کہ وہ انسانوں کے درجات کا تعین کرتے وقت ان کی رنگت کی جانب اپنی توجہ کو مبذول کر لیتا ہے[1]۔

7۔ معاشی مفادات کی بنیاد پر قومیت

انسان کی بنیادی ضروریات کے پورا ہونے کے لیے معاشی حالات کا بہتر ہونا ناگزیر ہے۔ اس لیے ہر فرد اور قوم اپنے معاشی حالات میں بہتری پیدا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ قومیت کو تصورات پر عمل پیرا گروہوں میں معاشی مفادات کی بنا پر تصادم اور اتحاد کے اتار چڑھاؤ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لیے سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے معاشی اغراض کو انسانی خود غرضی کا ناجائز بچہ قرار دیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ انسان کے لیے دنیا میں بے شمار وسائل ہیں لیکن انسان کی خود غرضی اس کو ان وسائل سے استفادے کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے ان وسائل کا دروازہ بند کرنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ چنانچہ اسی خود غرضی کا شکار ہونے والے انسانوں کے اشتراک سے ایک وحدت پیدا ہو جاتی ہے جس کو قوم کا نام دیا جاتا ہے۔ قوم کے مطابق وہ اپنے معاشی مفادات اور حقوق کے تحفظ کے لیے مصروف عمل ہوتی ہے جب کہ حقیقت میں ہر گروہ اپنے گرد ایسا ہی ایک حصار کھینچ لینے کے بعد دوسروں کے لیے عرصہ حیات تنگ کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ مغربی دنیا کے طاقت ور ترین ممالک میں یہی مقابلہ جاری ہے اور ان کی کوشش ہے کہ دنیا کے تمام وسائل پر ان کا قبضہ ہو جائے اور دیگر تمام اقوام ایک ایک لقمے کے احتیاج کا شکار ہو جائیں[2]۔

8۔ مشترکہ سیاسی نظام پر قومیت کی تشکیل

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق مشترکہ حکومت کی بنیاد پر بھی قومیت کی مضبوط تشکیل نہیں کی جا سکتی ہے کیونکہ حکومتیں اپنی طاقت اور قوت کے بل بوتے پر عوام الناس کو سلطنت کے ساتھ وفادار رکھنے میں عارضی طور پر کامیاب ہو سکتی ہیں لیکن اس کے مستقل استحکام کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ جب حکومت کا تسلط کمزور ہو جائے، عوام بغاوت کرتے ہیں اور الگ الگ ریاستیں بنا لیتے ہیں۔ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اس ضمن میں مغلیہ حکومت کو بطور

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص228

2۔ ایضاً، ص228

مثال پیش کیا ہے جس کی مرکزی طاقت کے ضعف کے فوری بعد ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بغاوتیں اٹھیں اور ہر قوم نے اپنی اپنی الگ سلطنت کا اعلان کر دیا۔ اسی طرح عثمانی حکومت نے آخری حد میں ترکی قومیت کا قصر تعمیر کرنے کی بہت کوشش کی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس لیے ایک حکومت کے ماتحت رہنے والے لوگوں کو ایک قوم قرار دینا منطقی اور عقلی اعتبار سے درست نہیں ہے[1]۔

مغربی قومیت اور اسلامی موقف

مولانا مودودیؒ کا موقف ہے کہ جوں جوں انسان کی تعلیم اور اس کی فکری صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے، توں توں مغربی اقوام کے تصوراتِ قومیت کا پردہ فاش ہوتا ہے اور پھر انسان ایک مخصوص نہج پر پہنچ کر ان کی غیر وسیع تاثیر سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے انسانوں کے مابین کسی حسی اور مادی فرق کو قبول نہیں کیا ہے بلکہ اسلام کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں[2] ان کے مابین وطنیت اور مولد و مدفن کی بنا پر کوئی تفریق قائم نہیں کی جاسکتی ہے[3]۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو نسلوں اور خاندانوں میں محض شناخت کے لیے تقسیم فرمایا ہے[4]۔ اس نسلی تقسیم کی بنا پر ایک دوسرے پر مفاخرت اور تصادم کی قطعا کوئی اجازت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض سرکشوں کا تباہ کرنے کے لیے ان کو گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں[5] جس کے بعد وہ آپس میں لڑتے لڑتے تباہ ہو جاتے ہیں۔ انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کر کے ان پر حکومت کرنا فرعون کے سیاسی نظام کا خاصہ تھا[6]۔ اس نے اپنی رعایا کو قبطی اور غیر قبطی میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس لیے اس سے گریز انتہائی اہم ہے۔

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا موقف ہے کہ مسلمانوں کے لیے قرآن مجید نے حزب کا لقب استعمال کیا ہے ۔ قوم کی بنیاد نسل و نسب جب کہ حزب کی بنیاد اصول ہے۔ اس طرح مسلمان قوم نہیں بلکہ حزب یعنی پارٹی قرار پاتے ہیں[7]۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کے لیے دوسرا لقب امت استعمال ہوا ہے[8]۔ امت اس جماعت کو کہا جاتا

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص229

2۔ النساء:1

3۔ الانعام:98

4۔ الحجرات:13

5۔ الانعام:65

6۔ القصص:4

7۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص262۔ اس ضمن میں مولانا مودودی نے سورۃ المجادلہ کی آیت نمبر19 سے استدلال کیا ہے۔

8۔ البقرہ:2/143۔ آل عمران:3/110 (اسلامی ریاست، ص:265)

ہے جس کے افراد کو کسی "امر جامع" نے مجتمع کر دیا ہو۔ اسی طرح احادیث میں مسلمانوں کے لیے "جماعت" کا لقب بھی مستعمل ہے[1]۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق زمین کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے[2] اور انسان کو کسی ایک خطے میں محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اس کو پوری زمین کی وسعتوں سے استفادہ کرنے کی ترغیب دی ہے[3]۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو قرآن میں زمین پر اللہ کا خلیفہ قرار دیا گیا ہے[4]۔ قرآن مجید میں کسی بھی مقام پر انسان کو نسلیت یا وطنیت کے ساتھ مربوط نہیں کیا گیا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید بغیر کسی قوم اور وطنیت کی تخصیص کے پوری انسانیت سے خطاب کرتا ہے۔ البتہ مکہ کو اس سے مستثنیٰ رکھا ہے لیکن اس کے باشندوں کو دیگر علاقوں کے باشندوں کے برابر قرار دیا ہے[5]۔ مکہ کے مشرکین کو ان کے اعمال اور کردار کی بنا پر نجس قرار دیا گیا ہے[6]۔

سید مودودیؒ نے عہدِ رسالت میں قومی عصبیت کی کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں جن کے مطابق:

- بعثت نبوی ﷺ کے وقت نسل و وطن کے تعصبات اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے مطابق قرآن مجید کو کسی سردار پر نازل ہونا چاہیے تھا[7]۔
- اسی قومی عصبیت کی بنا پر مشرکین مکہ نے بنو ہاشم کے ساتھ دشمنی مول لے لی تھی اور بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں پناہ گزیں ہونا پڑا تھا۔
- اسی قومی عصبیت کی بنا پر یہودیوں نے نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو سچا جاننے کے باوجود جھٹلا دیا تھا۔
- اسی عصبیت کی بنا پر عیسائیوں نے آپ ﷺ کو رسول ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کی دانست کے مطابق آخری پیغمبر کی آمد شام میں متوقع تھی۔ نبی ﷺ کا دعوتی خط موصول کر کے ہرقل اور مقوقس نے اسی توقع کا اظہار کیا تھا۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص266

2۔ الحج:65

3۔ النساء:97

4۔ البقرہ:30

5۔ الحج:25

6۔ التوبۃ:28

7۔ الزخرف:31

- قومی تعصب کی بنا پر ہی ایران کے حکمران نے نبی ﷺ کا نامہ مبارک وصول کر کے غصے سے پھاڑ دیا کیونکہ اس کے مطابق آپ ﷺ کا تعلق ایک غلام قوم کے ساتھ تھا اور اس کی نظر میں عرب کم تر درجے کے حامل تھے۔
- خود ریاست مدینہ میں یہودیوں نے جنگ بعاث کا ذکر چھیڑ کر ایک مرتبہ دو مسلمان گروہوں (اوس اور خزرج) کے مابین قبائلی عصبیت کو جگا کر لڑائی کروانے کی کوشش کی[1]۔
- منافقین مدینہ نے مسلمانوں کو مدینہ میں دیکھ کر وطنیت کے تعصب کا شکار ہو کر ان کے خلاف سازشیں کرنا شروع کر دیں۔ ابن ابی نے انصار کو کئی مرتبہ مشورہ دیا کہ وہ مہاجرین کی مدد کرنا چھوڑ دیں۔ اگر وہ ایسا کر دیں تو مہاجرین کچھ ہی عرصہ بعد مدینہ سے کوچ کر جائیں گے[2]۔
- عصبیت کے زیر اثر منافقوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بد کرداری کا الزام لگایا۔ بعد میں اس کے قبیلے خزرج نے اس کی حمایت کر کے اس کو قذف کی سزا سے بچا لیا تھا[3]۔

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے وہ احادیث بھی نقل کی ہیں جن میں قبائلی عصبیت کی بھرپور نفی کی گئی ہے[4]۔ ان کا موقف ہے کہ اسلام کا تصورِ قومیت مادی اور علاقائی و نسلی بنیادوں پر نہیں بلکہ روحانی بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اسلام کے مطابق انسان دو اقوام میں منقسم ہیں۔ ایک قوم مسلمان اور دوسری قوم کفار ہیں۔ مسلمان قوم کو قرآن مجید نے امت[5] قرار دیا ہے۔ دوسری قوم کئی طبقات میں منقسم ہے اور اس کا تعلق مختلف طبقات کے ساتھ ہونے کے باوجود اس کو ایک ہی خیال کیا جاتا ہے اور اس کو کفار کا نام دیا گیا ہے[6]۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی گھر کے دو افراد اسلام اور کفر سے تعلق رکھنے کے باوجود دو الگ الگ قوموں کے ارکان تسلیم کیے جائیں۔ ممکن ہے کہ رنگ کا اختلاف ہو لیکن اللہ کی نظر میں عقیدے کی بنا پر معاشی مشترکات، زبان، رنگ، قوم، نسل اور علاقے کے اختلاف کے باوجود

1۔ آل عمران:100 کا شان نزول

2۔ المنافقون:7-8

3۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص236

4۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص237 تا239

5۔ البقرہ:143

6۔ التوبۃ:37

کلمہ گو افراد ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ یہاں امت میں شامل ہونے کے لیے کلمہ طیبہ کا اقرار ناگزیر ہے اور اسی کی بنیاد پر انسانی زندگی میں دوستیاں اور دشمنیاں تشکیل پاتی ہیں[1]۔

کیا اختلافِ مذہب کی بنیاد پر اپنے رشتے داروں کے ساتھ حسنِ سلوک ممنوع ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے وضاحت کی ہے کہ اسلام صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور قطع رحمی سے منع کرتا ہے۔ مذہب کے اختلاف کے باوجود مباح امور میں والدین کی فرماں برداری لازم ہے۔ سید مودودیؒ کے الفاظ میں:

> "غیر مسلمانوں کے ساتھ مسلمان قوم کے تعلقات کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت تو یہ ہے کہ انسان ہونے میں ہم اور وہ یکساں ہیں اور دوسری حیثیت یہ ہے کہ اسلام اور کفر کے اختلاف نے ہمیں ان سے جدا کر دیا ہے۔ پہلی حیثیت سے ہم ان کے ساتھ ہمدردی، فیاضی، رواداری اور شرافت کا ہر وہ سلوک کریں گے جو انسانیت کا مقتضیٰ ہے اور اگر وہ دشمن اسلام نہ ہوں تو ان سے دوستی، مصالحت اور مسالمت بھی کر لیں گے اور مشترک مقاصد میں تعاون سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ لیکن کسی طرح کا مادی اور دنیوی اشتراک ہم کو اور ان کو اس طور سے جمع نہیں کر سکتا کہ ہم اور وہ مل کر ایک قوم بن جائیں اور اسلامی قومیت کو چھوڑ کر کوئی مشترک ہندی یا ینی یا مصری قومیت قبول کر لیں کیونکہ ہماری دوسری حیثیت اس قسم کے اجتماع میں مانع ہے اور کفر و اسلام کامل کر ایک قوم بن جانا محال ہے[2]۔

اپنے رشتے داروں کے ساتھ دنیاداری کے حوالے سے حسن سلوک لازم ہے لیکن ان کے کفریہ مذاہب سے براءت کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے قرآنی آیات اور احادیث سے استدلال کیا ہے[3]۔ انہوں نے صحابہ کرام میں دین و مذہب کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کی مندرجہ ذیل مثالیں بھی پیش کی ہیں:

- حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ کا تعلق ایران سے تھا لیکن ان کو سلیمان بن اسلام کہا جاتا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کو اپنے اہل بیعت میں شمار کرتے تھے۔
- نبی ﷺ نے باذان رضی اللہ عنہ کو یمن اور ان کے بیٹے ساسان رضی اللہ عنہ کو صنعا کا والی بنایا تھا جب کہ ان کا نسب بہرام گور سے جاملتا تھا۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص242، 241

2۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص242، 243

3۔ سید مودودی نے اس ضمن میں احادیث کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل آیات بطور مستدلات پیش کی ہیں: سورۃ الممتحنہ:60/4۔ سورۃ التوبہ:9/23۔ سورۃ التغابن:64/14۔ سورۃ النساء:4/89۔ سورۃ آل عمران:3/103۔ سورۃ التوبہ:9/11۔ سورۃ الفتح:48/29 (اسلامی ریاست، ص:243-247)

- حبشہ سے تعلق رکھنے والے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ "سیدنا و مولانا" کے لقب سے پکارتے تھے۔
- روم سے تعلق رکھنے والے صہیب رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر نے اپنی جگہ کھڑا امامت کے لیے کھڑا کر دیا تھا۔
- حضرت ابو خذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام سالم رضی اللہ عنہ کے بارے میں شہادت کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں خلافت ان کو سونپ دیتا۔
- نبی ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اپنی پھوپھی کی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔
- اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے ایک ایسے عسکری لشکر کا سردار بنا دیا جس میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ابو عبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابہ بھی شریک تھے۔
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ اسامہ کا باپ تیرے باپ سے زیادہ افضل ہے[1]۔

نبی ﷺ کو مکہ سے محبت تھی اور اس محبت کا اظہار آپ ﷺ نے ہجرت مدینہ سے قبل فرمایا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مدینہ جا کر مکہ بہت زیادہ یاد آتا تھا لیکن وطن کی اس محبت نے بھی مسلمانوں کو ہجرت کرنے سے نہ روکا تھا[2]۔ ہجرت مدینہ کے بعد انصار کا مہاجرین کے ساتھ اخوت و ایثار سے بھرپور تعاون بھی اسلامی تصورِ قومیت کی اعلیٰ مثال ہے۔ مشرکین کے ساتھ ہونے والی جنگوں میں مسلمانوں نے خود اپنے ہی رشتے داروں کے ساتھ تصادم کیا تھا جس کے مطابق:

- جنگ بدر میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت عبد الرحمان پر تلوار چلائی۔
- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے والد ابو حذیفہ پر حملہ کر دیا تھا۔
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں کو قتل کیا تھا۔
- نبی ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ، چچازاد بھائی عقیل، داماد ابو العاص رضی اللہ عنہ کو بدر میں گرفتار کیا تھا۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص247، 248

2۔ سید مودودی نے اس ضمن میں دعویٰ کیا ہے کہ "حب الوطن من الایمان" حدیث نہیں ہے بلکہ یہ نبی ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کیا گیا ہے۔ (اسلامی ریاست، ص:249)

- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تجویز دی کہ تمام قیدی قتل کر دیے جائیں اور ہر قیدی کو اس کا عزیز مسلمان قتل کرے۔
- فتح مکہ کے موقع پر نبی ﷺ غیر قبائل کے ساتھ اپنے قبائل پر حملہ آور ہوئے جس کے بعد غیر کی تلواریں اپنوں پر چلوائیں۔
- فتح مکہ اور فتح حنین کے موقع پر انصار کے دل میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ نبی ﷺ اپنے خاندان کے طرف دار ہیں تو آپ ﷺ نے ان کو جمع کر کے وضاحت فرمادی کہ میرا جینا اور میرا مرنا اب آپ لوگوں کے ساتھ۔ میں اللہ کا رسول ہوں، کسی کا طرف دار نہیں ہوں۔
- غزوہ بنو مصطلق کے بعد عبد اللہ بن ابی نے قبائلی عصبیت کو جگا کر مسلمانوں میں خانہ جنگی برپا کرنے کی کوشش کی تو اس کے اپنے ہی بیٹے عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اپنے والد کا سر کاٹ کر لانے کی اجازت طلب کر لی۔ یہی نہیں بلکہ اس کے سامنے تلوار سونت کر کھڑے بھی ہو گئے۔ نبی ﷺ کو اس کی خبر ملی تو آپ نے عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اپنے والد کو مدینہ میں داخل ہونے دیں۔
- حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا تعلق خزرج کے ساتھ تھا اور بنو قینقاع خزرج کے حلیف تھے۔ اس کے باوجود جب عبادہ رضی اللہ عنہ کو حکم بنا کر بھیجا گیا تو انہوں نے قبائلی تعلق کی پروانہ کرتے ہوئے بنو قینقاع کی ملک بدری کا حکم سنایا[1]۔

سید مودودیؒ نے ان مسلمانوں پر سخت تنقید کی ہے جو اپنے آپ کو اسلامی تہذیب اور تاریخ سے جوڑنے کے بجائے اپنے اپنے علاقائی تعارف کے ساتھ منسوب کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ مغربی افکار کی اندھی تقلید کا نتیجہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح ایک سینے میں دو دل نہیں ہو سکتے ہیں اسی طرح ایک دل میں اسلام کا تصور امت اور جدید قومیت کا تعصب بھی جمع نہیں ہو سکتا ہے[2]۔

لہذا سید مودودیؒ نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد "لا الہ الا اللہ" کو قرار دیا کہ ہر کلمہ گو، بلا امتیاز سیاہ و سفید یا غریب و امیر یا کسی اور سبب، امۃً واحدۃً کا فرد ہے جبکہ دوسری ملتوں کے پیروکار اپنی قومیت کا اظہار یا تو کسی خاندانی، لسانی، علاقائی، معاشی یا دوسری کسی انسانی وضع کردہ وجوہات کی بنیاد پر کرتے ہیں۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص 251-253

2۔ اس تنقید کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مودودی، اسلامی ریاست، ص 256 تا 259

فصل دوم

اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیادیں

سید مودودیؒ کے افکار کی روشنی میں

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے سامنے اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیادوں کی توضیح ایک چیلنج کی صورت میں موجود تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کے عہد میں برصغیر کے مفکرین کی جانب سے اسلام کے سیاسی نظریہ کی مختلف توضیحات پیش کی گئی تھیں اور سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کو ان تمام توجیہات سے جزوی یا کلی طور پر اختلاف تھا۔ جس اشتراکیت نے اپنے پر پھیلانے شروع کیے، بعض جوانب سے یہ آوازیں آنا شروع ہو گئیں کہ اشتراکیت عین اسلام کی ہی قدرے ترمیم شدہ شکل ہے۔ اسی طرح آمریت کی تائید میں بھی اطاعتِ امیر کے پہلو کو بنیاد بنا کر کئی آوازیں سامنے آئی تھیں۔ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق سوشل ازم اور آمریت کو اسلام کے ساتھ مربوط کرنے والے افراد کو اسلام کے سیاسی نظام کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ اگر انہوں نے اسلام کے سیاسی نظام کا بغور مطالعہ کیا ہوتا تو وہ کسی بھی صورت اس کو آمریت یا اشتراکیت کے ساتھ موافق قرار نہ دیتے۔ ان کا موقف ہے کہ مسلمان طبقات کی جانب سے اس طرح کا معذرت خواہانہ رویہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ:

> "شاید وہ اسلام کو اس یتیم بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو ہلاکت سے بس اس طرح بچ سکتا ہے کہ کسی بااثر شخص کی سرپرستی اس کو حاصل ہو جائے۔ یا پھر غالباً ان کا خیال ہے کہ ہماری عزت محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتی بلکہ صرف اسی طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلک میں دنیا کے کسی چلتے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جھلک دکھا دیں[1]"۔

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا موقف ہے کہ اسلام کے کسی ایک پہلو کو بھی اکائی کی صورت میں نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ اسلام کو اس درخت کی مانند سمجھنا چاہیے جو وسیع و عریض احاطے میں پھیلا ہونے کے باوجود اپنے بیج کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام کے تمام احکامات آپس میں مربوط ہیں۔ اس اعتبار سے اسلامی ریاست کی تشکیل کو بھی اسلام کے بنیادی عقائد کی مدد سے مکمل کیا جانا چاہیے۔ اس ضمن میں اسلامی ریاست کی نظریاتی اساس کو سمجھاتے ہوئے سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے مندرجہ ذیل پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص120، 121

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا دعویٰ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب میں خدا کا کوئی نہ کوئی تصور موجود ہے اور مشرکین عرب بھی اللہ تعالیٰ کو کائنات کا خالق ومالک تسلیم کرتے تھے:

﴿وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ﴾[1]

ترجمہ: اگر تم اِن لوگوں سے پُوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سُورج کو کس نے مسخّر کر رکھا ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر یہ کدھر سے دھوکا کھا رہے ہیں؟۔

"كانوا إذا سئلوا عن خالق السماوات والأرض ، ومسخر الشمس والقمر ، ومنزل الماء من السماء ، ومحيي الأرض بعد موتها بهذا الماء . . يقرون أن صانع هذا كله هو الله . ولكنهم مع هذا يعبدون أصنامهم ، أو يعبدون الجن ، أو يعبدون الملائكة ؛ ويجعلونهم شركاء لله في العبادة ، وإن لم يجعلوهم شركاء له في الخلق . هو تناقض عجيب "[2]

ترجمہ: اگر ان سے زمین و آسمان کے خالق، سورج اور چاند کے مسخر کرنے والے، آسمان سے پانی کے نازل کرنے والے اور اس پانی سے زمین کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کے بارے میں پوچھا جائے؟. وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان سب کا بنانے والا خدا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بتوں یا جنوں یا فرشتوں کی پرستش کرتے ہیں۔ اور وہ ان کو عبادت میں خدا کا شریک بناتے ہیں، خواہ وہ مخلوق میں ان کو اس کا شریک نہ بنائیں۔ عجیب تضاد ہے۔

اسلام نے الٰہ اور رب کے تصور کو محض ذہنی تسلیم کی حد تک نہیں رکھا بلکہ اس نے عبادت کو مفہوم کو وسیع کرتے ہوئے "جو وہ قانون بنائے اس کی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اس پر چڑھ دوڑنا، جہاں اس کا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا" سکھایا ہے[3]۔ دورِ حاضر میں اس نوعیت کے نظریہ کو اقتدار (Sovereignty) کا نام دیا جاتا ہے جبکہ سید مودودیؒ اسی کو حاکمیت الٰہیہ (Devine Sovereignty) قرار دیتے ہیں[4]۔

ریاستی نظریہ سے متعلق انسانی المیہ

انسانی دنیا میں معلوم تاریخ کے مطابق کبھی بھی کسی غیر انسانی مخلوق نے انسانوں کو اپنی اطاعت اور عبادت پر مجبور نہیں کیا ہے بلکہ ہمیشہ انسان ہی دوسرے انسانوں سے اپنی عبادت کروانے کا مرتکب ہوا ہے۔ جس کے پاس دولت اور اقتدار کی طاقت آئی ہے اس نے دوسروں سے پر اپنا حکم چلا کر اپنے سامنے ان کے سر جھکوائے ہیں۔ اس

1۔ العنکبوت:61

2۔ سید قطب، فی ظلال القرآن، (قاہرہ: دار الشروق)، 2/110

3۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص126

4۔ مودودی، خلافت وملوکیت، ص9

ضمن میں سید مودودیؒ نے فرعون اور نمرود کی مثال پیش کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ فرعون اور نمرود دونوں کے پاس قوت، طاقت اور اقتدار موجود تھا۔ اس اقتدار اور اختیار کی بنا پر وہ لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کرتے تھے[1]۔ ان کے مطابق وہ انسانی دنیا میں سب سے بڑے مقتدر تھے[2]۔ وہ اس خود پرستانہ دعاوی میں اس حد تک متعصب تھے کہ اس کا اقرار کرنے سے منکر ہونے والوں کو سخت سزائیں دیا کرتے تھے۔ سید مودودیؒ اس طاغوتی مزاج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔۔۔۔ یہ خدائی کا دعویٰ فرعون اور نمرود نے کی تھا، کچھ انہی دو آدمیوں تک محدود نہ تھی۔ دنیا میں ہر جگہ فرماں رواؤں کا یہی دعویٰ تھا اور یہی دعویٰ ہے۔ ایران میں بادشاہ کے لیے خدا اور خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور ان کے سامنے پورے مراسم عبودیت بجالائے جاتے تھے۔ حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدایگاں (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا اور نہ وہ خود اس کے مدعی تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں فرمانروا خاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے۔ چنانچہ سورج بنسی اور چندر بنسی[3] آج تک مشہور ہیں۔ راجا کو ان داتا یعنی رازق کہا جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کیے جاتے تھے۔ حالانکہ پرمیشور اور پرماتما ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجا کو تھا اور نہ پرجا ہی ایسا سمجھتی تھی[4]۔

انسان طاقت اور اقتدار کے بعد دیگر انسانوں پر خدائی قائم کرنے کی کوشش ہمیشہ سے کرتا آرہا ہے اور یہی فساد کی اصل جڑ ہے۔ انسانی خدائی کا یہ تسلط بعض اوقات بالواسطہ اور بعض اوقات بلاواسطہ بھی نظر آتا ہے۔ اس حقیقت کا بھی ہزاروں سالوں کے انسانی تجربات کے بعد بھرپور ادراک ہو چکا ہے کہ انسان کسی بھی ہستی کو معبود ضرور بنالیتا ہے۔ اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کو اپنا الٰہ نہیں مانا تو بھی اس کی گردن پر ارباب اور نظام کی صورت میں کوئی نہ کوئی معبود مسلط ہو کر رہے گا۔ عصرِ حاضر میں طاقت ور اقوام قوانین تیار کرتی ہیں جن کو کمزور اقوام مجبوراً اپنا لیتی ہیں۔ جمہوری ممالک میں سیاسی پارٹیوں کو تفویض کیے گئے اختیارات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بھی غیر محسوس طریقے سے الہیت کے درجات دیے گئے ہیں۔

اسلامی ریاست کی نظریاتی اساس اور سیاسی پارٹیاں

عہد نبوی، عہدِ خلافت راشدہ اور بعد میں بھی مسلمان ریاستوں میں کسی حزب اختلاف کا ذکر نہیں ملتا ہے۔ باغی گروہوں نے جب بھی اسلامی ریاست کے خلاف سر اٹھایا، ان کا قلع قمع کر دیا گیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

1۔ نمرود نے ایک شخص کو سزائے موت دے دی تاکہ ابراہیم علیہ السلام کے مقابلے میں اپنے آپ کو زندگی اور موت کا مالک باور کروا سکے۔

2 ۔ فرعون نے اسی بنا پر "انا ربکم الاعلیٰ" کا دعویٰ کیا تھا۔

3۔ ہندو راجپوتوں کی اعلیٰ ترین نسل کے دو طبقات ہیں

4۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص 129-130

کے خلاف بلوائیوں کی بغاوت کا ایک پہلو سیاسی بھی تھا جس میں آپ رضی اللہ عنہ پر اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے کا الزام تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں خارجی بھی اسی بنیاد پر الگ ہوئے تھے کہ ان کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کے مطابق سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ جدید سیاسی جمہوری نظام میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا تصور بالکل نیا ہے جو سراسر مغرب کی دین ہے۔ سیاسی پارٹیوں کی صورت میں انسانوں کے پاس اختیارات کا ہونا ریاستوں کے لیے مفید ہے یا مضر؟ اس کا جواب دیتے ہوئے سید مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:

> "انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کم ظرف آدمی کو پولیس کا کمشنر بنا دینے یا ایک جاہل کو وزیر اعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔۔۔۔ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الہیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں کئی مفاسد نے جنم لیا ہے۔ ان مفاسد میں ناہمواری، بے اعتدالی، ناجائز انتفاع، طغیان اور ظلم وغیرہ شامل ہیں۔ انسان کے دل و دماغ پر، اس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر ہی رہیں جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشوو ارتقاء کو روک دیا[1]۔

اسلامی ریاست میں پارٹی سازی

سیاسی پارٹیاں ریاستی امور میں کارکنوں کے لیے نظریاتی تنوع پیدا کرتی ہیں جس کی بنا پر پارٹی کا منشور کارکن کے لیے مذہبی نظریات اور اخلاقی تقاضوں سے زیادہ اہم قرار پاتا ہے۔ بعض اوقات پارٹی کی طرف جانبدارانہ مزاج اللہ تعالیٰ کے احکامات کو نظر انداز کرنے کا سبب بنتا ہے۔ پارٹی کا منشور اور سیاسی رہنما اللہ تعالیٰ اور اس کی تعلیمات کے متوازی ایک مستقل مقام پا لیتے ہیں جو شرک کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی بھی سیاسی کارکن خواہ وہ مذہب پسند ہو یا لادین ہو، اس کا شکار ہو سکتا ہے۔ اسی ضمن میں سید مودودی کا موقف ہے کہ مشرک اور دہریہ بھی ارباب اور الٰہوں سے چھٹکارا نہیں پا سکا ہے اور اسی بنا پر ریاستی سطح پر بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں۔ ان سے چھٹکارا پانے کے لیے لازم ہے کہ انسان ان تمام ظاہری اور باطنی معبودوں سے چھٹکارا پالے اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر اقرار کرے تا کہ اس کو سماجی و ریاستی امور کو ایک الہامی جہت مل سکے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ جملہ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ انسانوں کو انسانوں کی عبادت سے نکال کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے نظام کو اپنانے کی دعوت دیں اور انسانوں کے تیار کردہ نظاموں کے طوق اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں۔

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾[2]

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص132

2۔ الاعراف:54

ترجمہ: خبر دار رہو! اُسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔

اس ضمن میں سید قطب لکھتے ہیں کہ نظریاتی اعتبار سے اسلامی ریاست کی نوعیت دیگر نظامِ ہائے سیاست سے اس انداز سے مختلف ہے کہ اس میں حاکمیت کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور وہی قانون ساز ہے۔ دوسرے سیاسی نظریات کے مطابق انسانوں پر انسانوں کی حاکمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں امور ایک دوسرے سے متناقض ہیں اور ان کے مابین کبھی بھی موافقت پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے اسلام کا سیاسی نظریہ غیر اسلامی سیاسی نظریات سے مختلف ہی نہیں بلکہ ممتاز بھی ہے[1]۔

﴿ذٰ لِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ﴾[2]

ترجمہ: یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اسی کی بندگی کرو۔

﴿قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾[3]

ترجمہ: کہو، "اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے"

﴿یَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَیَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبَاتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبَائِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَیْهِمْ﴾[4]

ترجمہ: وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بند شیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔

چنانچہ معلوم ہوا کہ قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس ے احکامات کا نفاذ اولین فریضہ ہے جس کا دائرہ کار مذہبی عبادات ورسومات سے آگے بڑھ کر سیاسی امور کی انجام دہی کو بھی اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ سیاسی دنیا میں اس کے احکام کا نفاذ ریاستی اصولوں کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

1۔ سید قطب، العدالۃ الاجتماعیۃ، ص542

2۔ الانعام:102

3۔ آل عمران:64

4۔ الاعراف:157

قرآن مجید اسلامی ریاست کے نظریاتی اصولوں کے بارے میں مختلف جہتوں سے احکامات صادر کرتا ہے۔ ان کا مغز یہ ہے کہ قانون سازی کے اختیارات انسانوں، تحریکوں اور اداروں سے سلب کر لیے جائیں۔ ہر مطاع کو مطیع بنایا جائے اور اطاعت و قانون سازی کا حق اللہ تعالیٰ کے اختیار میں تسلیم کر لیا جائے۔ قرآن مجید میں اس کی سخت تاکید کی گئی ہے۔

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ﴾[1]

ترجمہ: فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو یہی ٹھیک سیدھا طریق زندگی ہے۔

﴿اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّه لِلّٰهِ﴾ [2]

ترجمہ: سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ﴾[3]

ترجمہ: اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔

﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ [4]

ترجمہ: جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

اس نظریاتی بنیاد کا فہم واضح کر دیتا ہے کہ اسلامی ریاست میں صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کی جاتی ہے نیز اسی کو ہی قانون ساز قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اختیار کسی پیغمبر کے پاس بھی نہیں ہے۔ انبیاء بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات کے پابند قرار پاتے ہیں[5]۔ عام لوگوں پر انبیاء کی فرماں برداری اس لیے لازم ہوتی ہے کہ وہ کوئی بھی حکم اپنی جانب سے جاری نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کی تعلیمات مکمل طور پر وحی الٰہی کی روشنی میں پیش کی جاتی ہیں۔

1۔ یوسف:40

2۔ آل عمران:154

3۔ النحل:116

4۔ المائدہ:44

5۔ الانعام:50

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ [1]

ترجمہ: ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اذن خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ [2]

ترجمہ: وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا۔

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ﴾ [3]

ترجمہ: کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔

مذکورہ تفصیلات سے معلوم ہوا کہ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق اسلامی ریاست کی نظریاتی بنیاد ہی اس عقیدے پر رکھی گئی ہے کہ اس کی کلی حاکمیت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ انبیاء اور دیگر مسلمان اسی اختیار کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے مکلف ہیں۔

نبی کی معاشرتی، سماجی اور سیاسی حیثیت محض روحانی نوعیت کی نہیں ہوتی ہے بلکہ ان کی ذمہ داریوں میں ایک اہم ذمہ داری اپنے معاصر نظاموں کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق ڈھالنا ہے۔ عصرِ حاضر میں یہی ذمہ داری مسلمان علماء پر لاگو ہوتی ہے اور مسلمانوں میں ملی وحدت کے قیام اور استحکام کے لیے یہی ایک بنیادی و اساسی اصول ہے۔ کوئی بھی سیاسی پارٹی جب اپنے منشور کی تشکیل کی جانب جاتی ہے تو اس کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے کارکنوں کے کس طرح اپنے ساتھ جوڑ کر رکھے اور ان کی سیاسی وابستگی میں کسی قسم کی کمزوری واقع نہ ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ کارکنوں کے سامنے پارٹی کا تقدس اور پارٹی رہنماؤں کی اہمیت و فضیلت کو واضح کرتی ہے جس کے نتیجے میں کارکن یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک نظریاتی محاذ کا سپاہی بن چکا ہے۔ کارکن کی نظر میں رہنما کا قول حرف آخر ہوتا ہے۔ اس کو دینی تعلیمات، اسلامی شعائر اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے بڑھ کر پارٹی اور اس کا منشور عزیز ہوتا ہے۔ چنانچہ سیاسی پہلو پر لوگوں کی ایک بڑی تعداد شرک میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

1۔ النساء:64

2۔ الانعام:89

3۔ آل عمران:79

فصل سوم

اسلامی ریاست کا انتظامی ڈھانچہ (پارلیمان)

سید مودودیؒ کے افکار کی روشنی میں

ریاست کا ڈھانچہ بنیادی طور پر انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست کی انتظامیہ

کسی بھی ریاست خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی ہو، کو چلانے کے لیے قابل اور دور اندیش و تجربہ کار افراد کی ایک ٹیم کی ضرورت ہوتی ہے جس کا کام ریاست کے انتظامی امور کو چلانا ہے۔ اس ٹیم کی اہمیت و ضرورت سے انکار نہیں ہے۔ قرآن مجید اس کی تشکیل کی تاکید کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَانًا نَصِيرًا﴾[1]

ترجمہ: اور دعا کرو کہ پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

اس آیت کی تشریح مولانا مودودیؒ نے ان الفاظ میں لکھی ہے کہ:

> "یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش اور معاشی کے سیلاب کو روک سکوں اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کر سکوں[2]۔

سید مودودیؒ کے مطابق اصلاح مشن کی کامیابی صرف وعظ و نصیحت کے ذریعے ممکن نہیں ہے بلکہ اس لیے مسلمانوں کے پاس سیاسی قوت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مذکورہ دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین کے قیام اور شریعت کے نفاذ کے لیے اگر کوئی شخص حکومت کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے تو وہ ایک مندوب و مطلوب کام کے لیے کوشش کرتا ہے۔ سید مودودیؒ کے مطابق وہ لوگ جو اس کوشش کو دنیا طلبی یا دنیا پرستی سے تعبیر کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں کیونکہ:

1۔ بنی اسرائیل:50

2۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص 173

"دنیا پرستی اگر ہے تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے[1]"۔

سید مودودیؒ نے یوسف علیہ السلام کو بطور مثال پیش کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ جس اصلاحی و اخلاقی انقلاب کے وہ داعی تھی اس لیے قوتِ اقتدار ناگزیر تھی۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ نے ان کو حکومت و زمامِ کار دی تو انہوں نے اس کو فائدہ اٹھایا تھا۔ انہوں نے خود عزیز مصر سے مطالبہ کیا تھا کہ:

﴿قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾[2]

ترجمہ: اس نے کہا مجھے اس زمین کے خزانوں پر مقرر کر دے، بے شک میں پوری طرح حفاظت کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں۔

یوسف علیہ السلام کا یہ مطالبہ حصولِ جاہ کے لیے ملازمت کی عرضی نہیں تھی۔ نہ ہی بادشاہ نے آپ علیہ السلام کا اشارہ پا کر جھٹ سے ان کو یہ منصب پیش کر دیا تھا۔ بلکہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے انقلاب کا راستہ کھولنے کا آغاز تھا۔ یوسف علیہ السلام نے گزشتہ دس بارہ برسوں میں اپنے اندر ایک اخلاقی طاقت کی نشوونما کر رکھی تھی اور اس قوت و طاقت کو فتح حاصل کرنے کے لیے ایک آغاز مل گیا تھا۔ آپ علیہ السلام معاملہ فہمی، ذہانت و فراست، عالی ظرفی، ضبطِ نفس، حلم، راست بازی اور امانت داری میں اپنے زمانے کے تمام لوگوں سے بڑھ کر تھے۔ نیز ان کی شخصیت و کردار کے اوصاف اکثر لوگوں کے سامنے اس طرح کھل چکے تھے کہ کسی کو بھی آپ علیہ السلام کی افضلیت سے انکار نہیں تھا۔ خود بادشاہ بھی آپ علیہ السلام کے اوصاف کا قائل تھا۔ آپ علیہ السلام کا حفیظ و علیم ہونا محض ایک دعویٰ نہیں تھا بلکہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت تھی۔ تالود کے مطابق آپ علیہ السلام کے مطالبہ کے بعد حکمران اور اس کی کونسل نے آپ کے مطالبے کو بسر و چشم قبول کر لیا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ پھل پک چکنے کے بعد اب ٹوٹنے کا منتظر تھا۔

مولانا مودودیؒ نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ جن لوگوں نے "خزائن ارض" اور بعد کے قرآنی واقعات سے مراد یہ لیا ہے کہ یوسف علیہ السلام وزارت مالیات کا عہدہ طلب کر رہے تھے وہ غلطی پر ہیں۔ قرآن مجید اور اسرائیلی مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں یوسف علیہ السلام کو مختار کل بنایا گیا تھا۔ ملک کے تمام امور کی زمامِ کار ان کو سونپ دی گئی تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطابق یوسف علیہ السلام اس وقت تخت نشین تھے جب یعقوب علیہ السلام اپنے خانوادے کو لے کر ان کے ہاں گئے تھے۔ یوسف علیہ السلام کا وہ فقرہ بھی قرآن مجید میں مذکور ہے جس

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص174

2۔ یوسف:55

میں انہوں نے کہا کہ "اے اللہ تو نے مجھے بادشاہی دی ہے [1]۔ اسی طرح پیالہ چوری ہونے والے واقعہ میں بھی "بادشاہ کا پیالہ" کے الفاظ قرآن مجید میں مذکور ہیں [2]۔ اس پر مستزاد یہ کہ تورات میں یوسف علیہ السلام کی تاج پوشی سے قبل عزیز مصر کا طویل بیان موجود ہے اور اس میں اس کے مندرجہ ذیل الفاظ ہیں کہ:

"دیکھ! میں تجھے سارے ملک مصر کا غلام بناتا ہوں [3]"۔

تالمود سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے مصر سے واپس جا کر اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے یوسف علیہ السلام کا تذکرہ اس طرح کیا تھا جس طرح کسی حکمران کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ علامہ زمخشری نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے بادشاہت کی محبت یا دنیاوی لالچ میں یہ مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ حق کو قائم کرنے اور عدل کو پھیلانے کے لیے یہ مطالبہ کیا تھا تاکہ اس مقصد کو حاصل کیا جاسکے جس کے لیے انبیاء کرام کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔

اسلامی ریاست میں حکمران اور انتظامی ٹیم کی اہمیت کے پیش نظر معروف مسلمان فلسفی الفارابی نے لکھا ہے کہ حکومت کی مشینری انسانی جسم کی مانند ہے۔ چنانچہ مملکت کا رئیس دل کی طرح اہم ہے۔ اسی طرح انتظامیہ کے دیگر ستون بھی اعضائے جسم کی طرح ہیں [4]۔

اسلامی ریاست کی انتظامیہ کی نوعیت

کسی بھی ریاستی نظام کی تشکیل میں بنیادی نوعیت کا ایک ہی سوال ہے کہ اس کے انتظامی معاملات کس طرح چلائے جانے چاہییں۔ لادینی سیاسی نظاموں میں ریاست کے باشندوں کو حاکمیت اعلیٰ سونپی جاتی ہے۔ ان کی آراء کی روشنی میں قوانین بنتے اور منسوخ ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاستی کا انتظامی ڈھانچہ اس سے یکسر مختلف ہوتا ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی توضیحات اور رہنمائی کی روشنی میں ریاست کا انتظامی ڈھانچہ تشکیل دیا جاتا ہے۔ ریاستی باشندے اس انتظامیہ کے تیار کردہ قوانین کی پیری کرنے کے مکلف ہیں۔

سید مودودیؒ نے اسلامی ریاست کے انتظامی امور کو دیکھتے ہوئے اس کو کسی بھی صورت میں جمہوریت کا نام دینے سے اختلاف کیا ہے بلکہ ان کے مطابق صحیح نظام، الٰہی حکومت ہے جس کو انگریزی میں Theocracy کہتے

1۔ یوسف: 101

2۔ ایضاً: 72

3۔ پیدائش، باب 41، فقرہ نمبر 41، (کتاب مقدس کی اولین کتاب کو اس پروٹسٹنٹ اردو ترجمہ میں پیدائش کا جبکہ کیتھولک ترجمہ میں تکوین کا نام دیا جاتا ہے)

4۔ ابو الفضل محمد الفارابی، آراء اہل المدینہ الفاضلہ، ص 86

ہیں۔ مگر یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے اسلامی تھیاکریسی اس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اس تھیاکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے[1]۔ اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو الٰہی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیاکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہی ہوتی بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو (Theo-Democracy) یعنی الٰہی حکومت کے نام سے موسوم کروں گا کیونکہ اس میں خدا کے اقتدار اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کا ایک محدود عمومی حاکمیت عطا کی گئی ہے۔ اس میں انتظامیہ اور مقننہ مسلمانوں کی رائے سے بنے گی۔ مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔

وہ تمام انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہو گا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہو گا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، جہاں خدا اور اس کے رسول ﷺ کا حکم موجود ہو، وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو، کسی مقننہ کو، کسی مجتہد اور عالم دین کو بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل بھی اس حکم میں یک سر مو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ تھیاکریسی ہے[2]"۔

انتخاب کے وقت ملحوظ رکھی جانے والی شرائط

اسلام اعتقادات، عبادات، معاملات اور اخلاقیات کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کا ہر پہلو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ اس کی بنیاد پر قائم ہونے والی ریاست کی باگ دوڑ سنبھالنے والی انتظامیہ کے تمام افراد کی شخصیتوں اور کردار میں یہ چاروں چیزیں بدرجہ اتم موجود ہوں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾ [3]

1۔ آگے حاشیہ باندھ کر سید مودودی نے لکھا ہے کہ عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح علیہ السلام کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں۔ لہذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور یہ کہہ کر انھیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں (البقرہ:79) اسلامی ریاست، ص139

2۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص139، 140

3۔ البقرہ:208

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کے پیچھے مت چلو، یقیناً وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

چنانچہ ریاست اسلامیہ کی انتظامی ٹیم میں شامل ہونے کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جانا چاہیے جو اس کے اسلامی دستور پر کامل یقین رکھتے ہوں اور ان کے ماضی میں جھانک کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ انہوں نے اسلامی دستورِ حیات کے مطابق اپنی زندگیاں گزاری ہیں۔ ان لوگوں کا اسلام کے اصلاحی نظام سے پوری طرح متفق ہونا ضروری ہے۔

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق اسلامی ریاست کے اعلیٰ مناصب پر سرفراز ہونے والوں میں چار شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

(1) منتظمِ اعلیٰ مسلمان ہو۔

(2) مرد ہو۔

(3) عاقل و بالغ ہو۔

(4) اسلامی ریاست کا شہری ہو۔

اس کے علاوہ کچھ ایسی شرائط کا تعین بھی کیا گیا ہے جن کا تعلق اخلاق و عادات کے ساتھ ہے۔ یہ شرائط کبیرہ گناہوں میں مبتلا نہ ہونا، مضبوط اعصاب کا مالک ہونا، جسمانی طور پر صحت مند ہونا، انصاف پسند ہونا، دینی و دنیوی علوم کا ماہر ہونا، امانت دار ہونا وغیرہ ہیں۔

ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جانا چاہیے جو اسلام کی حقیقی روح کو اچھی طرح سمجھ چکے ہوں اور اس کی تفاصیل سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ اس ضمن میں کسی جغرافیائی، لسانی یا نسلی حدود کی پابندی نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اسلام کی کاملیت اور عالمگیریت نے تمام انسانوں کے سامنے اپنے اصلاحی پروگرام، مقاصد اور دساتیر کو پیش کیا ہے۔ اس انتظامی جماعت میں ہر وہ کلمہ گو فرد شامل ہو سکتا ہے جو کسی بھی قوم، رنگ یا نسل و ملک سے تعلق رکھتا ہو۔ جو شخص اس اصولی موقف پر یقین نہ رکھتا ہو وہ مسلمان نہیں بلکہ کوئی غیر مسلم ہی ہو سکتا ہے اس لیے اُس کو ریاستی امور کی انجام دہی پر مامور انتظامیہ میں شامل ہونے کا کوئی حق نہیں ہے[1]۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص148

اس موقف میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ اپنے معاصر علماء کے ساتھ موافق ہیں۔ نو مسلم مفکر علامہ محمد اسد[1] اور امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد[2] بھی اسی موقف کے حامل تھے کہ اسلامی مملکت کا حکمران صرف ایک مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُون﴾[3]

ترجمہ: اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اُن کے لیے اُن کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے اُن کے حق میں پسند کیا ہے، اور اُن کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا، بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

اس آیت کی تشریح میں سید مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:

> "خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مؤمنون سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوتی ہے وہ عمومی خلافت ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے، ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے[4]"۔

اسلامی ریاست میں کسی فرد یا گروہ کے لیے ایسی کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی جا سکتی ہے جس کی بنیاد اس کی پیدائش کے علاقے یا خاندان کے ساتھ ہو۔ ذاتی قابلیت کی بنا پر ہر فرد اپنی شخصیت کے ارتقاء کے لیے یکساں مواقع کا

---

1. Muhammad Asad. *Principles of state*. P: 35-41

2۔ ابو الکلام آزاد، مسئلہ خلافت، (دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاوس، 1987ء)، ص 53

3۔ النور: 55

4۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص 153

مولانا مودودی نے اس ضمن میں اپنے موقف کی تائید کے لیے خطبہ حجۃ الوداع کا اقتباس پیش کیا ہے جس کے مطابق کسی شخص کو رنگ، نسل یا زبان کی بنا پر کسی دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتری اور فضیلت کا میرٹ تقویٰ ہے۔

حق دار قرار پاتا ہے۔ اس کے لیے آگے بڑھنے اور کسی بھی منصب تک جانے کے راستے کھلے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں غلاموں اور غلام زادوں کو فوجوں کی سپہ سالاری تفویض کی گئی تھی اور اشرافیہ کے شیوخ نے ان کے احکام کی تعمیل کی تھی۔ مختلف پیشوں کے ساتھ منسلک افراد مفتی، فقیہ اور قاضی بن گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حکم صادر فرمایا کہ:

((اِسمَعُوا وَاَطِيعُوا وَلَو استَعمَلَ عَلَيكُم عَبد حَبشِي))[1]

ترجمہ: سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا سردار ایک حبشی ہی کیوں نہ بنا دیا جائے۔

ایک اہم نقطہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی انتظامیہ کے انتخاب کے لیے ہر مسلمان مرد و عورت کے پاس رائے دیے کا حق موجود ہے کیونکہ وہ خود خلافت کا حامل ہے۔ انتظامی ڈھانچے میں شامل ہونے کے لیے اسلام نے افراد کے لیے کسی معیارِ ثروت کو بنیاد نہیں بنایا ہے بلکہ اس کے لیے ایمان اور صالح کردار ہی شرط ہے۔ اس اعتبار سے ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی ہے۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے اسلام کو اشتراکیت اور فاشزم سے ممتاز کرتا ہے۔ اس میں فرد کی اپنی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے اور وہ اجتماعیت میں گم نہیں ہو جاتی ہے جب کہ اجتماعیت پر فرد اس انداز میں اثر انداز نہیں ہوتا ہے کہ اس کی انفرادیت معاشرے کی اجتماعیت کو متاثر کر سکے۔ مقصدِ حیات کے اعتبار سے اسلام کی نظر میں فرد اور جماعت دونوں برابر ہیں۔ دونوں کا مقصد اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کا نفاذ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔

امام شوکانی نے اس ضمن میں یہ شرط بھی بیان فرمائی ہے کہ انتظامیہ کے لیے ذمہ دار کا انتخاب کرتے وقت محض مسلمان ہونا ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس نوعیت کی ذمہ داری ادا کرنے والے انسان کے اندر صلاحیت اور قابلیت بھی موجود ہو[2]۔

امام ابو الحسن ماوردی[3] اور ابو یعلیٰ محمد بن حسین لفراء[4] نے اسلامی ریاست کے منتظمِ اعلیٰ میں اجتہاد کی صلاحیت، دینی و شرعی علوم میں مہارت، صائب الرائے ہونا، اعضاءِ بدن کا صحیح سلامت ہونا، ثابت قدمی، اولو العزمی، تواضع، شجاعت، سخاوت، عدالت وغیرہ ایسی صفات لازم قرار دی ہیں۔ بعد میں ابن خلدون نے ان شرائط کو

1۔ بخاری، محمد بن اسماعیل البخاري، الجامع الصحیح (بیروت: دار ابن کثیر 1407ھ)، کتاب الاحکام، باب السمع والطاعۃ للامام مالم تکن معصیۃ، ح6723

2۔ شوکانی، محمد بن علی بن محمد الشوکانی، فتح القدیر (بیروت: دار المعرفہ)، 3/416

3۔ الماوردی، احکام السلطانیۃ، ص6

4۔ الماوردی، احکام السلطانیہ، ص20

مختصر کرتے ہوئے اعضاءِ جسم کی سلامتی، کفایت، عدالت اور علم تک محدود رکھا۔ ابن خلدون کے مطابق خلیفہ میں اجتہاد کی صلاحیت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے[1]۔ ابن تیمیہ نے صدق، عزم، شجاعت، امانت اور قوت کو بھی لازم قرار دیا ہے[2]۔ ان کے مطابق اجتہاد کی صلاحیت لازم نہیں ہے البتہ خلیفہ کا صائب الرائے ہونا ضروری ہے تاکہ اگر علماء کے مابین اختلاف ہو جائے تو وہ کسی ایسی رائے کو اختیار کر سکے جو کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہو۔ ابن خلدون اور ابن تیمیہ کے مطابق قریشیت، خلافت کی شرط نہیں ہے[3]۔ شاہ ولی اللہ ن بھی امامت کی اہلیت کے لیے وہی شرائط پیش کی ہیں جو ماوردی کے ہاں مذکور ہیں[4]۔

اسلامی ریاست کی انتظامیہ کے اختیارات کی تحدید

اسلام نے انسان کو عقل و شعور کے بھرپور استعمال کی تاکید کی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد آیات میں عقل والوں کو زمین و آسمان کے نظام پر غور و فکر کر کے کائنات کے سربستہ رازوں کو سمجھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اسلام اور سائنس کے عنوان سے لکھی جانے والے کتب میں ان آیات کو بطور مستدلات پیش کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب اسلام نے حاکمیت اور قانون سازی کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے اور انسانوں کی قانون سازی کا مطلقاً نفی کی ہے۔ انسان قانون سازی کے عمل میں اپنی عقل کو استعمال کرتا ہے۔ انسانی ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر قانون سازی کے عمل میں انسانی عقل کو رہبر و رہنما بنانے سے منع کیوں کیا گیا ہے؟

سید مودودیؒ اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جسم و جان اور عقل و فکر کی آزادی دے رکھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قانون سازی کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے تاکہ اس کو محفوظ رکھا جا سکے۔ بصورت دیگر انسان بے راہ روی کا شکار ہو کر خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار سکتا ہے۔ مغربی دنیا میں بھی جب کوئی ریاست قائم ہوتی ہے تو وہاں کے باشندوں کو اپنے ملک کا اختیار چند مخصوص اور منتخب لوگوں کے سپرد کرنا پڑتا ہے تاکہ وہ قانون سازی کر کے ملک کا انتظام و انصرام کریں۔ چونکہ مغربی تہذیب میں امانت داری اور اخلاقیات کا الہامی نظام موجود نہیں ہے اس لیے وہاں سیاسی انتظامیہ کا حصہ بننے کے متمنی محض وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جن میں دوسروں کو جھوٹے پراپیگنڈے، چالاکی، علم اور دولت کی بنا پر دھوکا دے کر بیوقوف بنانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ لوگوں سے ووٹ لینے والے یہی نمائندے اپنے اپ خدا بن بیٹھتے ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے قوانین میں عوام کا فائدہ نہیں ہوتا

1۔ ابن خلدون، عبد الرحمٰن بن خلدون، مقدمہ بن خلدون، ص215-217

2۔ ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیۃ، ص9،8

3۔ ایضاً، ص11

4۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، ازالۃ الخفاعن خلافۃ الخلفاء، (دمشق: دار القلم، 1434ھ)، ص17

ہے بلکہ یہ اپنے مفادات کی خاطر قوانین بناتے ہیں۔ امریکہ اور انگلستان سمیت جن ممالک کو جمہوریت کی جنت کہا جاتا ہے ان تمام ممالک میں یہی حالت ہے[1]۔

اسلامی ریاست میں انتظامی و قانونی اختیارات انسانوں کے ہاتھ میں نہ دینے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انسان فطری طور پر جذباتی واقع ہوا ہے۔ اس ضمن میں اس کی نظر میں وہی امور درست قرار پاتے ہیں جو اس کے اپنے مفاد میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں انسانوں کو انتظامی اختیارات سونپے جاتے ہیں ان میں کئی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً امریکہ میں یہ حقیقت تسلیم کی جاچکی تھی کہ شراب انسانی صحت کے لیے انتہائی مضر ہے اور انسان کی ذہنی و عقلی قوتوں کو منفی اعتبار سے متاثر کرتی ہے۔ چنانچہ 1918ء میں امریکی کانگریس نے شراب کو قانونی طور پر ممنوع قرار دیا تھا۔ عوام نے اس کی ممانعت کے حق میں ووٹ دیے تھے لیکن جب اس کا عملی نفاذ کیا گیا تو انہی عوام نے اس قانون کے خلاف بغاوت کر دی۔ لوگوں نے مختلف اقسام کی شرابیں بنانا اور ان کو پینا شروع کر دیا۔ اس سے معاشرتی سطح پر جرائم میں اضافہ ہونے لگا جس کے بعد 1933ء میں شراب کو قانون طور پر حلال قرار دیا گیا تھا[2]۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سید مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:

> "اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں جن سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضح قانون بنانے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ اگر اس کو دوسرے معبودوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ بن جائے گا اور اپنے نفس کے شیطان کو الٰہ بنالے گا۔ لہذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے اپنے مفاد میں مناسب حدیں لگادی جائیں[3]"۔

اسلامی ریاست کے انتظامی پہلو سے متعلق انسانی اختیارات کو محدود کرنے کا مقصد یہی ہے کہ توازن اور اعتدال کو قائم رکھا جائے۔ انسان کی عقل کو آزاد رکھا گیا ہے لیکن بعض مخصوص امور میں اس کی آخری حدود کا تعین بھی کر دیا گیا ہے۔ ان حدود میں رہ کر انسان اپنے رویوں کے لیے فروعی اور ضمنی ضوابط کی تشکیل کر سکتا ہے لیکن اس کو ان حدود سے باہر جانے کی قطعی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو زندگی کے جملہ معاملات کا نظام مختل اور فاسد ہو کر رہ جائے گا۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں فرد کو دولت اور ملکیت کی افراط میں آزاد رکھا گیا تھا جس کے نتیجے میں طبقاتی جنگ پیدا ہوئی اور ایک طبقہ دوسرے طبقے پر چڑھ دوڑا۔ چنانچہ اس طبقاتی تصادم کا انجام کار مزدوروں کی آمریت کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے دیے گئے معاشی نظام کے مطابق اسراف اور بخل سے گریز کیا جاتا، دولت کمانے کے حلال ذرائع کا اختیار کیا جاتا، وراثت کا قانون اللہ تعالیٰ

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص140، 141

2۔ ایضاً، ص142

3۔ ایضاً، ص143

کی تعلیمات کی روشنی میں تشکیل دیا جاتا، جوئے اور سٹے سے پرہیز کیا جاتا، سود کو حرام سمجھ کر اس سے اجتناب کیا جاتا، زکوٰۃ و صدقات کو اپنایا جاتا اور شخصی ملکیت کو جائز حدود و قیود میں رکھا جاتا تو دنیا کبھی بھی تقسیمِ زر کے معاملے میں کسی ایسے تصادم کا شکار نہ ہوتی جس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ اپنی زندگیوں بازی ہار جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے ایک ایسا انتظامی ڈھانچہ فراہم کر دیا ہے جو اس کی عقل و فکر کی آزادی کو سلب یا معطل نہیں کرتا ہے بلکہ اس انتظامی ڈھانچے کو بھی بعض حدود و قیود کا پابند کر کے یوں پیش کرتا ہے کہ اس کے لیے ایک صاف اور واضح راستے کا تعین ہو جائے۔ بصورت دیگر یہ ممکن ہے کہ انسان اپنی کسی شخصی کمزوری کی بنا پر زندگی کے نظام کو تباہ نہ کر بیٹھے۔ سید مودودیؒ نے اس حوالے سے پہاڑی راستوں کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ پر پیچ پہاڑی راستوں میں جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں، سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی سلب کرنا ہے؟ نہیں! در اصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ، ہر موڑ اور ہر امکانی خطرے کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ تیرا راستہ ادھر نہیں اُدھر ہے، تجھے اس رخ پر نہیں اُس رخ پر مڑنا چاہیے تاکہ تو بسلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے۔ بس یہی ان حدود کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لیے زندگی کے سفر کا صحیح رخ معین کرتی ہیں اور ہر پر پیچ مقام، ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اس طرف ہے، تجھے ان سمتوں پر نہیں بلکہ اُس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیے[1]"۔

اللہ تعالیٰ کی حدود و قیود مقرر کی جا چکی ہیں۔ ریاست کی انتظامیہ اور عوام ان کے سامنے بغاوت تو کر سکتے ہیں ،ان کو تبدیل نہیں کر سکتے ہیں۔ جب بھی کسی اسلامی ریاست کی تشکیل ہو گی، اسی پیرائے میں ہو گی اور مسلمانوں کو مجبوراً اس کا عملی طور پر لحاظ رکھنا پڑے گا۔ اس ضمن میں سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ نے صراحت کے ساتھ سمجھایا ہے کہ اسلامی ریاست کی انتظامیہ کے افراد کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے خلفاء ایسی ہو گی جو اس کے فراہم کردہ اختیارات کو استعمال کرنے کے مجاز ہوں گے[2]۔

اسلامی ریاست کی انتظامیہ کی ذمہ داریاں

چونکہ ریاست اسلامیہ کے انتظامی اختیارات اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ ہیں اس لیے ان کو بروئے کار لاتے ہوئے چند مخصوص مقاصد کا حصول بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات میں واضح کر دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی دانست کے مطابق مندرجہ ذیل ذمہ داریاں اسلامی ریاست کی انتظامیہ پر عائد کی ہیں:

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص145

2۔ النور:55

1. سیاسی قوتِ کے استعمال کے ذریعے متوازن نظامِ زندگی قائم کرنا۔
2. قوتِ قاہرہ کے ذریعے اجتماعی عدل کو قائم کرنا۔
3. عبادات کے نظام کو انتظامی سطح پر منظم کرنا۔
4. نظامِ معیشت کو نیکی اور خیر کی بنیاد پر یوں تشکیل دینا کہ عوام اور اشرافیہ دونوں کے حقوق محفوظ رہیں۔
5. امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے دعوت و تبلیغ کا شعبہ فعال کرنا[1]۔

اسلامی ریاست کی انتظامیہ کا اولین فریضہ دین کی حفاظت ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد ہی شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہے[2]۔ اس لیے خلیفہ اس ذمہ داری کا امین ہے۔ نفاذ شریعت کا کام انتہائی موثر صورت میں ہونا چاہیے تا کہ ملت کا شیرازہ نہ بکھر سکے اور امت کسی بھی پہلو سے زوال کی طرف گامزن نہ ہو[3]۔ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ:

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار　　قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں　　اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی[4]

علماء نے صراحت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ اسلامی ریاست کی انتظامیہ میں چونکہ حزب اختلاف کا کوئی تصور نہیں ہے۔ حزب اختلاف کا وجود سیاسی کمزوری کی جانب لے جاتا ہے اس لیے مسلمان خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دے جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سیاسی کمزوری پیدا ہو۔ اسلامی ریاست کا ہر ایک باشندہ اپنی رضامندی کے ساتھ اپنی قوت خلیفہ کو سونپ دیتا ہے اور اس کے بعد خلیفہ کو تمام انتظامی اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خلیفہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عدل و انصاف کا قیام، ظلم و زیادتی کا ازالہ، معاشرتی و سماجی اختلافات کی تحلیل اور حقوق عامہ کی نگہداشت کو یقینی بنائے۔ ان میں سے کسی ایک چیز کے ضمن میں بھی خلیفہ کی کارکردگی کمزور ہوئی تو عوام میں بے چینی کی لہر دوڑے گی اور مملکت اسلامیہ کا امن عامہ متاثر ہو جائے گا[5]۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص145، 146

2۔ ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، ص2

3۔ الماوردی، احکام السلطانیہ، ص12، 13

4۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، (الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، 2006ء)، ص305

5۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ابن خلدون، مقدمہ، ص134۔ الماوردی، احکام السلطانیہ، ص3۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، ص148

اسلامی ریاست کی انتظامیہ کا دائرہ کار

سماجی انصاف

اسلامی ریاست کی انتظامیہ سلبی نہیں بلکہ ایجابی مقاصد کی پیروی کرتی ہے۔ اس کا کام عوام الناس میں صرف ظلم و تعدی کا خاتمہ کرنا نہیں ہے، نہ ہی یہ محض عسکری سطح پر لوگوں کو تحفظ دینے کی پابند ہے بلکہ انتظامیہ کا اولین فریضہ معاشرتی سطح پر توازن کو قائم کرتے ہوئے عدلِ اجتماعی کو رائج کرنا ہے اس ضمن میں انتظامیہ کو بعض ایسے سخت فیصلے بھی لینے ہوتے ہیں جو بظاہر انسانوں کے حق میں نہیں ہیں لیکن ان فیصلوں کی بنیاد پر شر کا خاتمہ اور خیر کی ترویج ہو سکتی ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

چنانچہ اسلام انتظامیہ کو اس ضمن میں سیاسی طاقت کے استعمال اور تبلیغ و تلقین کا انتظام کرنے کا حکم بھی دیتا ہے۔ اس کے پاس یہ اختیار بھی ہے کہ وہ محض اپنی طاقت اور قوت کو ہی نہیں بلکہ رائے عامہ کو بھی استعمال کر سکتی ہے۔ لہٰذا انتظامیہ اپنے کام کو کسی مخصوص دائرے میں محدود نہیں رکھ سکتی ہے بلکہ اس کے کام کی نوعیت ہمہ گیر ہے۔ یہ انسانی زندگی کے جملہ امور تک اپنے دائرہ عمل کو وسیع کر لیتی ہے اور اپنے اخلاقی نظریات کے مطابق تمدن کے ہر شعبہ میں اصلاح کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

افراد کی نجی زندگی کا لحاظ

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اسلامی ریاست کی انتظامیہ کے فرائض پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ ریاست فاشسٹ اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتی ہے۔ اس ہمہ گیریت کے باوجود اس میں موجودہ زمانے کی کلی اور استبدادی ریاستوں کا سا رنگ نہیں ہے۔ اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت پائی جاتی ہے[1]"۔

انتظامیہ کے اختیارات اور عوام کی شخصی آزادی کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات میں انتہائی اعتدال موجود ہے جس کی مدد سے حق باطل کے درمیان سرحد کا تعین کر دیا گیا ہے۔ اس اعتدال کا مشاہدہ کرنے والا ہر فرد جو تسلیم و رضا کا پیکر ہو، اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص147

حکومت نہیں، خدمت

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ اسلامی ریاست کی انتظامیہ آمریت کی طرح مطلق العنان نہیں ہوتی ہے۔ یہ انسانوں کی خادم ہوتی ہے اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جواب دہ ہوتی ہے۔ مولانا مودودیؒ کے مطابق "یہاں ہر شخص خلیفہ ہے، کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے"۔ مسلمان کسی ایک فرد کو اعتماد کی بنا پر اپنا حکمران منتخب کرتے ہیں اور اپنی خلافت کو ریاست کی انتظامی اغراض پورا کرنے کے لیے اس منتخب شخص کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ سید مودودیؒ کے بقول:

> "وہ ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطاع مطلق یعنی آمر بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے کیونکہ آمریت دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے[1]"۔

منتظمین کا باعمل کردار

اس انتظامی ڈھانچے میں کام کرنے والے افراد کے لیے اسلام نے اختیارات کے ساتھ ساتھ کچھ تحدیدات کا تعین بھی کیا ہے۔ اختیارات کے پہلو میں انتظامیہ کے افراد کی ذمہ داری ہے کہ اسلام کو بطور ضابطہ حیات زندگی کی ہمہ گیریت کے ساتھ ہم آہنگ کریں اور اسلامی شریعت کو ریاست کے تمام شعبوں پر منطبق کریں۔ جب کہ دوسری جانب سید مودودیؒ کا موقف ہے کہ جانب اسلامی ریاست کی انتظامیہ خود اپنے طور پر کسی قسم کی ضابطہ بندی نہیں کر سکتی ہے۔ وہ ریاست کے باشندوں کو پیشوں کے انتخاب پر مجبور نہیں کر سکتی ہے۔ اسی طرح انتظامیہ ریاست کے باشندوں کے لیے تعلیم، ثقافت، تحریر کا رسم الخط اور لباس و فیشن کی پابند نہیں کر سکتی ہے:

> "یہ خداوندانہ اختیارات جو روس اور جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے اور جن کو اتاترک نے ترکی میں استعمال کیا، اسلام نے اپنے نظام میں امیر کو ہرگز عطا نہیں کیے ہیں"[2]۔

خلیفہ کا دائرہ اختیار

اسلامی ریاست کے انتظامی ڈھانچہ میں شامل افراد میں سب سے زیادہ اختیارات خلیفہ کے پاس ہوتے ہیں۔ امام کے اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے الماوردی نے مندرجہ ذیل امور کا ذکر بھی کیا ہے:

- افواج کی تنظیم۔
- مالیات و اقتصادیات کی نگرانی۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص153

2۔ ایضاً، ص154

- مختلف صوبوں کے لیے فنڈز کی منظوری۔
- اعلیٰ حکام کی نامزدگی۔
- قاضیوں کا تقرر۔
- صوبوں کی تشکیل۔
- صوبوں کے گورنروں کا تقرر۔
- عوام میں کمزور اور طاقت ور کے مابین توازن کا قیام۔
- بیرونی خطرات کے پیش نظر افواج کو لشکر کشی کا حکم دینا[1]۔

فارابی نے اسلامی ریاست کے منتظم اعلیٰ کے لیے یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ مختلف مناصب اور عہدوں کے لیے صرف اہل افراد کا تقرر کرے۔ اس ضمن میں میرٹ کے مطابق عہدوں کی تفویض کو یقینی بنانے کی صورت میں ہی ریاست کو منظم قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ عنصر مفقود ہو تو اسلامی ریاست کا شیرازہ بکھر جائے گا[2]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اسلامی ریاست کی انتظامیہ کی اہم ترین ذمہ داری کفالت عام قرار دی ہے۔ ان کا موقف ہے کہ:

> "نظام خلافت کے تحت ہر انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کی کفالت ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ جبراً بھی وصول کی جائے گی۔ یہ جبری وصولی اموالِ ظاہرہ ہی سے کی جائے گی اور ایک ایک پائی کا حساب لیا جائے گا[3]"۔

انہوں نے خواتین کے لیے معروف طریقے سے اکتساب مال کے وسائل پیدا کرنا بھی ریاست کی انتظامیہ کی ذمہ داری قرار دی ہے[4]۔

اسی طرح ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق ریاست اسلامیہ کے انتظامی امور کے ذمہ داران کے لیے لازم ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا پختہ اور مستحکم نظام قائم کریں تاکہ ریاست کے لوگوں کے افکار و نظریات کے ساتھ ساتھ ان کے اعمال کی اصلاح بھی ممکن ہو سکے[5]۔ صرف اپنی جغرافیائی حدود میں ہی نہیں بلکہ بیرونی دنیا کو اسلام کی دعوت دینا اور اسلام کی سربلندی کے لیے کفار کے ساتھ دعوت و تبلیغ سے آگے بڑھ کر جہاد و

1۔ الماوردی، احکام السلطانیہ، ص17۔ ابن تیمیہ، السیاسۃ الشریعۃ، ص12

2۔ فارابی، آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ، ص76

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام، ص40

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام میں عورت کا مقام، (لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن)، ص96

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، حزبُ اللہ کے اوصاف (لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن)، ص211

قتال کی راہ اختیار کرتے ہوئے اسلام کو عالمی سطح پر غالب کرنے کا سامان کرنا بھی اسلامی ریاست کی ہی ذمہ داری ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ:

" اس روحانیت کے لیے بھی دین میں گنجائش ہے' مگر اس وقت جب اللہ کا دین قائم ہو جائے۔ ایک بار اللہ کا دین قائم ہو جائے تو اب اس دین کو آگے پھیلانا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔ جب آپ سے مطالبہ کیا جائے گا کہ آؤ نکلو میدان میں تو آپ کو نکلنا پڑے گا[1]"۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے یہ موقف بھی پیش کیا ہے اسلامی ریاست کی انتظامیہ کا فرض ہے کہ وہ انسانی جان اور مال کی حفاظت کرے۔ اگر کسی باشندے کا قتل ہو جائے تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ قاتل کو تلاش کرے، گرفتار کرے اور اس کو کیفر کردار تک پہنچائے۔ اس ضمن میں ریاست مدعی نہیں بن سکتی ہے بلکہ مدعی مقتول کے ورثاء ہی بنیں گے۔ اگر قاتل دیت دینا چاہے تو وہ دیت مقتول کے ورثاء کو دی جائے گی، ریاست کا اس دیت پر کوئی حق نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے بقول:

" قاتل کو پکڑنے 'اس پر مقدمہ چلانے اور انصاف دلانے تک کے طویل اور پیچیدہ عمل میں ہر مرحلے پر مقتول کے ورثاء کی مدد کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ قتل کے مقدمات میں ریاست یا حکومت مدعی نہیں بنے گی' بلکہ مقتول کے ورثاء ہی مدعی ہوں گے۔ ہمارے ہاں جو ''سرکار بنام فلاں'' کے عنوان سے مقدمہ بنتا ہے وہ معاملہ سراسر غیر اسلامی ہے[2]"۔

اسلامی ریاست کی انتظامیہ اللہ تعالیٰ کی دی گئی خلافت کے مطابق اس کی نائب قرار پاتی ہے، اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ رعایا کے لیے اطاعت اور وفاداری کا اظہار اسی انتظامیہ کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ تمام وفاداریاں اللہ تعالیٰ کی ہی قرار پاتی ہیں کیونکہ اس نے عوام کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ حکمرانِ وقت کی اطاعت شعاری کا مزاج پیدا کریں اور اس کا عملی مظاہرہ بھی کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا﴾[3]

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہوئے، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

1۔ نووی، یحیٰ بن شرف الدین النووی، اَربعینِ نَووِی، ص137

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، 4/ 303

3۔ النساء:59

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اس آیت کو اسلام کے پورے سیاسی، تمدنی اور مذہبی نظام کی بنیاد قرار دیا ہے اور ان کے مطابق یہ آیت "ریاست کے دستور کی اولین دفعہ ہے"۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کے مطابق اصل مطاع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کی فرمانبرداری کا مکلف ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی دوسری اطاعت یا وفاداری صرف اس صورت میں منظور کی جائے گی کہ وہ خدا کی اطاعت کے مد مقابل نہ ہو بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے تحت اور اس کے تابع ہو۔ ایسی تمام اطاعتیں جو اللہ کے احکام کے ساتھ متصادم و متعارض ہو، اس کو حلقہ اطاعت سے باہر کر دیا جائے گا۔ اس کا ذکر نبی ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا ہے کہ ((لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق))۔ رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کی نوعیت مستقل بالذات اطاعت جیسی نہیں ہے بلکہ یہ اطاعت الٰہی کی ہی عملی صورت ہے۔ رسول اکرم ﷺ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ ہیں اور ان کے توسط سے ہی مسلمانوں تک اللہ تعالیٰ کے احکام اور اوامر نواہی پہنچے ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ کی اطاعت سے روگردانی کرنا اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کے مترادف ہے[1]۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے((مَن أطَاعَنِي فقَدْ أطَاعَ اللَّهَ، ومَن عَصَانِي فقَدْ عَصَى اللَّهَ))"[2]۔

ترجمہ: جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔

مذکورہ حدیث میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اولی الامر کی اطاعت کا حکم بھی دیا ہے۔ سید مودودیؒ کے مطابق اولی الامر کے مفہوم میں وہ لوگ شامل ہیں جن کے ذمے اسلامی ریاست کے انتظامی و اجتماعی معاملات ہوں۔ ان لوگوں میں ذہنی و نظریاتی رہنما، دینی علماء، سیاسی رہنما، انتظامی حکام، عدالتوں میں مامور قاضی، قبائل کے سردار وغیرہ شامل ہیں[3]۔ مولانا مودودیؒ نے وہ روایات بھی نقل کی ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ نے مسلمان حکمرانوں کی اطاعت کرنے کے لیے "معروف" کی شرط لگا رکھی ہے۔ اگر ان کی جانب سے کسی معصیت کے ارتکاب کا حکم آئے تو اس حکم کی نافرمانی کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ البتہ جب تک وہ اسلام کے ظاہری شعائر پر عمل پیرا رہیں تب تلک ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جائے گی۔ ظاہری شعائر میں نماز سر فہرست ہے۔ مولانا مودودیؒ کا موقف ہے کہ اگر حکمران اپنی ذاتی زندگی میں نماز قائم کریں اور ریاست میں اقامتِ صلوٰۃ کا نظام بھی نافذ کریں تو ان کے خلاف خروج نہیں ہو گا کیونکہ انفرادی اور ریاستی سطح پر نماز کے قیام سے ریاست کی نوعیت جزوی طور پر اسلامی ہی رہے گی۔ اگر کسی

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص200

2۔ بخاری، الجامع الصحیح، كِتَابُ الجِهَادِ وَالسِّيَرِ ، بَابُ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَاءِ الإِمَامِ وَيُتَّقَى بِهِ، ح2957

3۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص200، 201

ریاست کے حکمران خود نماز ادا نہ کریں اور اقامت صلوٰۃ کا نظام بھی نافذ نہ کریں تو "پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے الٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لیے جائز ہو جائے گی[1]۔

آیت میں مذکور کلمات ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کی انتظامیہ کا کوئی بھی فیصلہ حرفِ آخر نہیں ہوتا ہے بلکہ عوام کو خلیفہ اور اس کی شوریٰ کے ساتھ اختلاف کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ انتظامیہ کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ ادب الاختلاف کے نظریے کی پیروی کرتے ہوئے اپنے فیصلوں کو مقدس گائے قرار دینے کے بجائے عوام کی تنقید کے لیے کھول کر رکھے۔ اس صورت میں عوام اور حکمرانوں کے اختلاف کو حل کرنے کے لیے مذکورہ آیت کے مطابق قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جانا چاہیے۔ سید مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:

> "اس حکم کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کوئی ایسا ادارہ ہونا چاہیے جس کے پاس نزاع لے جائی جائے اور جس کا کام یہ ہو کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق اس نزاع کا فیصلہ کرے۔ یہ ادارہ خواہ کوئی مجدد علماء ہو یا سپریم کورٹ یا کوئی اور، اس کے تعین کی کسی خاص شکل پر شریعت نے ہمیں مجبور نہیں کر دیا ہے۔ مگر بہر حال ایسا کوئی ادارہ مملکت میں ہونا چاہیے اور اس کی یہ حیثیت خاص ہونی چاہیے کہ انتظامیہ اور مقننہ اور عدلیہ کے احکام اور فیصلوں کے خلاف اس کے پاس مرافعہ کیا جا سکے اور اس کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ کتاب و سنت کی ہدایات کے مطابق وہ حق اور باطل کا فیصلہ کرے[3]"۔

مذکورہ آیت قرآنی کی روشنی میں سید مودودیؒ اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ اسلامی ریاست کے قیام کیلئے اس بات کو بھی یقینی بنانا ضروری ہے کہ ریاست میں ایسے ادارے کا قیام ہو جو ریاست کے انتظامی، قانونی اور عدالتی امور کی نگرانی کرے۔ یہ ادارہ مجدد علماء کا ایک گروہ بھی ہو سکتا ہے اور سپریم کوٹ یا کسی اور صورت میں ایک ادارہ بھی ہو سکتا ہے، اس کی تعین کی کوئی خاص صورت نہیں ہے۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص202

2- النساء:59

3۔ ایضاً، ص204

باب سوم

اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو اور ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار

فصل اول: اقامت دین کے لیے انقلاب: عملی جدوجہد

فصل دوم: اسلامی ریاست کی معاشی و معاشرتی بنیادیں

فصل سوم: اسلامی ریاست کا سیاسی ڈھانچہ

فصل اول

اقامت دین کے لیے انقلاب: عملی جدوجہد

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق لفظ دین ایک ہمہ جہت اصطلاح ہے۔ یہ انسان کی زندگی کے پورے نظام کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کی رو سے انسان ایک ادارے یا ہستی کو حاکم مطلق، مقنن اور مطاع مان کر اس کی جانب سے سزا کے خوف اور جزا کے لالچ میں اسی کے مہیا کردہ ضوابط و قوانین کے مطابق زندگی گزارتا ہے[1]۔

ڈاکٹر اسرار احمد انسانی تاریخ کے تین اہم انقلاب قابل غور سمجھتے ہیں۔ ان کا گمان ہے کہ پہلا انسانی انقلاب اس وقت آیا تھا جب قسطنطین اعظم نے عیسائیت کو قبول کیا اور پھر عیسائیت کو روم کا سرکاری مذہب قرار دیا تھا۔ اس وقت روم دنیا کے تین بڑے براعظموں تک پھیلا ہوا تھا۔

دنیا میں یہودی اور مسلمان اپنے اپنے نظامِ ہائے حیات کی ترویج میں مصروف عمل ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد نے نیو ورلڈ آرڈر، جس کے قیام کے لیے غیر مسلم متحرک ہیں، کو جیو ورلڈ آرڈر قرار دیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کے بجائے دنیا میں اسلامک ورلڈ آرڈر کا غالب ہونا احادیث سے ثابت ہے۔ غلبہ اسلام کے اس مرحلے کا آغاز کسی ایک ملک میں نافذ ہونے سے ہو گا۔ اس کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس منہج انقلاب کی پیروی کی جائے جو نبی اکرم ﷺ نے عرب میں پیش کیا تھا[2]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ دنیا میں غلبہ اسلام کے لیے متحرک تحریکوں کی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ نبوی منہجِ انقلاب کی پیروکار نہیں ہیں[3]۔

مسلمان پر لازم ہے کہ وہ دین کو نہ صرف اپنی زندگی پر لاگو کرے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرے بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ دین کو معاشرے اور ریاست پر نافذ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ ڈاکٹر اسرار احمد اس ضمن میں ایک مکمل تصورِ انقلاب پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی دو کتابیں "رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب" اور "منہجِ انقلاب نبوی ﷺ" منصہ شہود پر آچکی ہیں[4]۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، مطالبات دین، (شعبہ تنظیم اسلامی، پاکستان، 2008ء)، ص76، 77

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، (مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور)، ص6

3۔ ایضاً، ص7

4۔ یہ دونوں کتابیں دراصل ڈاکٹر اسرار احمد کے خطبات کی تصنیفی صورتیں ہیں۔ اول الذکر کتاب ایک مختصر کتابچہ ہے جب کہ ثانی الذکر ڈاکٹر اسرار احمد کے ان چودہ خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے 1984ء میں دیے تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ ناگزیر ہے اور اس کے بغیر پاکستان کی بقا خطرے میں ہے[1]۔ یہ نفاذ انقلابی عمل سے ہی ممکن ہے۔ ان کا موقف ہے کہ انتخابی عمل کے ذریعے اس مقصد کو حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم نقطہ یہ بھی ہے کہ ملک میں زیادہ آبادی سنی مسلمانوں کی ہے اس لیے یہاں نافذ ہونے والا قانون خلافت عامہ کا قانون ہو گا وہ شیعہ کا امامت معصومہ والا نظام نہیں ہو گا[2]۔

مذکورہ دونوں کتب کی روشنی میں اس انقلاب کے مندرجہ ذیل اہم مراحل ہیں:

1۔ انقلابی نظریہ کی تشکیل

کوئی بھی انقلاب کسی انقلابی نظریہ کے بغیر وجود میں نہیں آتا ہے۔ اس فکر اور نظریے کی خوب نشر و اشاعت کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں اس کی اہمیت و افادیت واضح ہو جائے[3]۔

اسلامی انقلاب کی بنیاد میں اسلام کا نظریہ توحید کھڑا ہے جو کسی بھی انسان یا غیر اسلامی نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کی نفی کرتا ہے۔ اس کی دعوت "ان الحکم الا للہ" ہے۔ ماضی میں اسی انقلابی نظریے کی بنا پر مسلمان انگریز کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ اس عہد میں جمہوریت بدترین شرک کی صورت اختیار کر چکی ہے اور اس کے مقابلے میں اسلامی نظامِ حکومت و سیاست ہے[4]۔

اسی طرح اسلامی انقلابی نظریے کے مطابق کوئی بھی شخص سرمایہ داری یا کمیونزم کا حامی نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ یہاں ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور انسان کی حیثیت نائب کی ہے۔ اسلام کا نظریاتی نظام انسانوں کے مابین سماجی و معاشرتی انصاف پیدا کر کے ان کو برابری کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ یہاں بہتر اور افضل وہی ہے جو اخلاق و کردار اور تقویٰ و پرہیز گاری میں آگے بڑھ چکا ہے[5]۔

چنانچہ انقلابی نظریہ انسانی زندگی کے تین گوشوں کو متاثر کرتا ہے۔ ان میں سے پہلا حصہ مذہبی ہے جس کا تعلق انسان کی روحانی و اخلاقی زندگی کے ساتھ ہے۔ دوسرا پہلو سیاسی و معاشرتی جب کہ تیسرا پہلو انسانی زندگی کا معاشی حصہ ہے[6]۔

1۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک مستقل تصنیف "استحکامِ پاکستان" کے موضوع سے موجود ہے۔

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، (شعبہ تنظیم اسلامی، لاہور، 2008ء)، ص10

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، (لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن)، ص19

4۔ ایضاً، ص29

5۔ ایضاً، ص30 تا32

6۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، ص14، 15

2۔ انقلابی نظریہ کی نشر واشاعت اور تبلیغ

انقلابی تصور، فکر اور نظریے کی تبلیغ اور نشر واشاعت خوب سے خوب تر سطح پر کی جائے۔ اس کے نتیجے میں لوگ اس کو قبول کر لیں گے اور اس نظریے کو قبول کرنے والے افراد کو ایک تنظیم میں اکٹھا کیا جائے جس سے ایک ایسی جماعت وجود میں آئے گی جو انقلاب برپا کرنے کے لیے فعال اور تیار لوگوں پر مشتمل ہو گی[1]۔

اس جماعت میں فرق مراتب کی بنیاد خلوص اور عمل ہونی چاہیے۔ ہر وہ شخص جو جماعت کے ساتھ مخلص ہو اور اس کے منہج کے مطابق سرگرم اور فعال ہو اس کو ترقی دی جائے خواہ وہ سابقہ نظام کے مطابق کسی متوسط یا ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن اگر اس نے متعلقہ نظریہ کو دل و جان کی گہرائی سے مان لیا اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی دے رہا ہے تو اس کی توقیر اور تکریم پیدائشی وڈیروں سے بھی زیادہ ہو گی۔ اگر اس جماعت میں یہ بنیادی اصول ملحوظ نہیں رکھا جائے گا تو اس کو انقلابی جماعت قرار نہیں دیا جا سکتا ہے[2]۔

نبی اکرم ﷺ نے اسلام کے انقلابی نظریہ توحید کا خوب پرچار کیا اور اس وقت کے تمام طریقوں کو اختیار کرتے ہوئے اس کی تبلیغ کی۔ آپ ﷺ نے خود لوگوں کے گھروں میں جا کر، کبھی لوگوں کو اپنے گھر دعوت پر بلا کر اس کی دعوت دی۔ لوگوں نے انکار کیا، مذاق اڑایا اور آپ ﷺ کی حوصلہ شکنی کی۔ آپ ﷺ نے منڈیوں اور میلوں میں جا کر لوگوں کو اس انقلابی نظریہ کی طرف دعوت دی[3]۔

3۔ تنظیم و تربیت

جماعت میں موجود تمام کارکنان کی فکری و عملی تربیت کی جائے گی اور اس تربیتی عمل کا منہج معاشرے اور ریاست کی سطح پر دینی فکر کی بنیاد پر اصلاح اور تبدیلی کو عمل کو سامنے لانا ہے۔ جن کارکنوں کی تربیت نہ ہو سکے وہ خام اور ذہنی و فکری طور پر کچے ہوتے ہیں اس لیے ان کے عقائد و عمل میں استحکام تربیت کا متقاضی ہے[4]۔

اس تربیت کا مرکزی نقطہ بیعت و اطاعت ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام سے ایسی متعدد روایات ذکر کی گئی ہیں جن کے مطابق آپ ﷺ نے مسلمانوں سے ہر قسم کے حالات میں سمع و طاعت کی شرط پر بیعت کی تھی۔ یہ صرف نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کا ہی وطیرہ نہیں تھا بلکہ

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، ص19، 20

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی ﷺ، ص15

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، ص33، 32

4۔ ایضاً، ص20، 21

آپ ﷺ سے پہلے دنیا میں مبعوث ہونے والے انبیاء کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی لیے مبعوث فرمایا کہ اللہ کے حکم سے ان کی فرماں برداری کی جائے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾[1]

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی فرماں برداری کی جائے۔

ڈاکٹر اسرار احمد اسی تربیت کو عصر حاضر کے انقلابیوں کی زندگی میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ کروڑوں کی آبادی والے ملک میں دو چار ہزار افراد سے ملک کے نظام کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہاں براہ راست حکومت سے ٹکراؤ کے بجائے کارکنان کو اپنے ذاتی کردار اور معاشرے کی اصلاح پر زور دینا چاہیے۔ اس کے بدلے میں ان کو معاشی بحران اور معاشرتی مقاطعہ کا سامنا کرنا پڑے گا[2]۔

متعلقہ تنظیم اور تحریک میں نظم وضبط ناگزیر ہے۔ جس تحریک میں نظم وضبط آرمی جیسا ہو گا وہی انقلاب برپا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک جمے جمائے باطل نظام کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے کوئی ڈھیلی ڈھالی تنظیم کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے واضح کیا ہے کہ غیر تربیت یافتہ اور خام افراد کو اگر تنظیم کا حصہ بنا لیا جائے تو وہ سخت مرحلے میں داخل ہوتے ہی مزید ساتھ چلنے سے انکار کر دیں گے۔ اس لیے ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے جو پختہ اور مستحکم ہوں۔ اسی لیے انقلابی پارٹیوں کی جانب سے اپنے کارکنوں کے لیے ٹریننگ کیمپ بنائے جاتے ہیں[3]۔

ٹریننگ کا تعلق کس پہلو کے ساتھ ہونا چاہیے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کے لیے کارکنوں کی فکری و نظریاتی تربیت کی جانی چاہیے۔ اگر انقلاب کا تعلق مادی اقدار کے ساتھ ہے تو اس کے لیے تیار کیے گئے کارکنوں کی روحانی تربیت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے[4]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس جماعت کو حزب اللہ قرار دیا ہے اور اس حزب کے کارکنوں کے اندر مطلوب اوصاف پر اپنی کتاب "حِزبُ اللہ کے اوصاف" میں سیر حاصل بحث کی ہے اور یہ اوصاف کارکنوں کی تربیت کے بعد ہی پیدا کیے جا سکتے ہیں[5]۔

---

1 النساء:64

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، ص57

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی ﷺ، ص16

4۔ ایضاً، ص17

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، حِزبُ اللہ کے اوصاف، ص52 تا136

4۔ مزاحمت پر صبر

ان انقلابی کارکنوں کو جب میدان میں اتارا جائے گا اور وہ اصلاح و تبلیغ کا فریضہ سر انجام دینے میں مصروف عمل ہوں گے تب معاشرے اور ریاست کی جانب سے ان کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کی مخالفت کی جائے گی، ان پر مقدمات دائر کیے جائیں گے اور انہیں تشدد و تعذیب کا شکار بنایا جائے گا۔ اس کے جواب میں ان کے لیے لازم ہو گا کہ وہ کسی متشدد ردعمل کا مظاہرہ نہ کریں اور نہ ہی کسی جوابی کاروائی کے مرتکب ہوں۔ تشدد برداشت کرنے اور صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنے کے باعث بڑے پیمانے پر ہمدردی سمیٹی جائے گی اور یہی ہمدردی دعوت کے عمل کو تیز کرے گی[1]۔

ڈاکٹر اسرار احمد اس مرحلے کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شروع میں انقلابی جماعت کے دعوے اور اس کے نظریات لوگوں کے لیے مذاق کی صورت اختیار کر سکتی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انقلاب کے لیے متحرک افراد کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جائے۔ لیکن جب مخالفین دیکھیں گے کہ جماعت میں کارکنوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور جس تحریک کو ہوا کا جھونکا سمجھا جا رہا تھا وہ تنظیم اب زبردست طوفان ثابت ہو سکتی ہے۔ اس وقت ان کی جانب سے تشدد، عقوبت اور ایذا رسانی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر انقلابی جماعت کا وطیرہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ تشدد برداشت کرے لیکن نہ تو اپنے موقف سے دست بردار ہو اور نہ ہی تشدد کے بدلے میں مزاحمت کرے[2]۔

اس عدم تشدد سے معمور رویے اور ظالم قوتوں کی جانب سے سختیوں اور تکالیف کو پانے والوں کو معاشرہ بغور دیکھے گا اور سوچے گا کہ آخر ان پر حالات یوں تنگ کیوں کیے جا رہے ہیں۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ملکی و قومی سطح پر اس جماعت کے لٹریچر کا مطالعہ شروع ہو جائے گا جس کے بدلے میں جماعت کے قارئین کی ہی تعداد نہیں بلکہ اس کے ہمدردوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو جائے گا[3]۔

اس کی کئی نظیریں نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے معلوم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی شخص کو جب معلوم ہو کہ اس کے دشمن اس کا خاتمہ کر دیں گے تو وہ Desperate ہو کر دشمن پر حملہ کر کے اس کے بھی کچھ لوگ مار دے گا۔ اسی طرح اگر کسی بلی کو کارنر کر لیا جائے اور اس کو فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ ملے تو وہ شکاری کی آنکھوں پر حملہ کرتی ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب کا یہ مرحلہ اس مزاج کے کلیتاً برعکس ہے۔ یہاں کسی انقلابی کارکن کو مدافعتی مقصد کے لیے بھی پلٹ کر حملہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، ص 21، 22

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، ص 18

3۔ ایضاً، ص 19

کرام میں سے خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کو آگ کے انگاروں پر لٹا دیا گیا۔ وہ مزاحمت کر سکتے تھے لیکن صبر و تحمل کی پالیسی کی پیروی میں ان کا جسم جل گیا تھا۔

دنیا کا ہر انقلاب قربانی طلب کرتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے پیچھے بھی لوگوں کے اموال اور جانوں کی قربانیاں تھیں۔ اس لیے اسلامی انقلاب کے داعیوں میں بھی یہی جذبہ اور روح ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ کو دعوت کے ابتدائی تین برسوں میں لوگوں نے شاعر اور مجنوں جیسے القابات دیے۔ آپ ﷺ کو اس سے سخت تکلیف بھی ہوتی تھی[1] کیونکہ یہی لوگ پہلے آپ ﷺ کو صادق اور امین کے القابات دے چکے تھے، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے اس عمل کے جواب میں صبر کا مظاہرہ کرنے کی تاکید کی تھی[2]۔ تین سال بعد جب دشمنوں کو محسوس ہوا کہ یہ دعوت اب ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو جائے گی تو انہوں نے جسمانی تعذیب و تشدد کی راہ اپنائی اور مسلمانوں کے ساتھ سماجی مقاطعہ بھی کیا۔ ابو جہل نے حضرت یاسر اور سمیہ رضی اللہ عنہما کو شہید کر دیا اس کے باوجود نبی ﷺ نے لوگوں کو "کفوا ایدیکم" کا حکم دے رکھا تھا کیونکہ مسلمانوں کی جمیعت کمزور تھی۔ اگر وہ جوابی رد عمل کرتے تو شاید ان کو مکہ کے طاقت ور لوگ کچل کر رکھ دیتے۔ مسلمانوں کو اپنی جمیعت میں تقویت پیدا کرنے کے لیے مہلت کی ضرورت تھی نیز ان پر ہونے والے مظالم کی بنا پر ان کو لوگوں کی طرف سے ہمدردیاں بھی مل رہی تھیں۔ مسلمانوں کو حاصل ہونے والی ہمدردی کی ایک نظیر شعب ابی طالب میں گزرے ہوئے تین برسوں میں بھی ملتی ہے۔ اس میں بنو ہاشم کے وہ لوگ بھی مسلمانوں کے ساتھ محصور تھے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد طائف میں نبی اکرم ﷺ کو جس ستم و قہر کا نشانہ بنایا گیا تھا وہ بھی اسی انقلابی مرحلہ کے حوالے سے ایک رہنما منظر ہے[3]۔

5۔ اقدامی کاروائی

عدم تشدد پر کاربند جماعت کے ساتھ لوگوں کی ہمدردیاں بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی افرادی قوت بڑھتی جائے گی اور ان کے نظریات بھی مستحکم تصور ہوتے جائیں گے۔ جب کارکنوں کی تعداد میں اضافہ ہو گا اور انقلابی جماعت کے افراد تعداد اور قوت کے اعتبار سے زیادہ مستحکم ہو جائیں گے۔ ان کے پاس اسلام مخالف نظام کا سامنا کرنے کی طاقت ہو گی تو پھر اگلے مرحلے میں داخل ہو کر وہ محض صبر کے بجائے اقدامی کردار ادا کرتے ہوئے تصادم کی راہ اپنائیں گے[4]۔

1۔ الحجر:96

2 المزمل:10

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسولِ انقلاب کا طریق انقلاب، ص37 تا45

4۔ ایضاً، ص24

اب شریر طاقتوں کو شتر بے مہار نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ ان کی سرکشی کا دائرہ کار صرف ان کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہو گا بلکہ ان کی وجہ سے معاشرہ اور ریاست دونوں مفاسد میں گھر جائیں گے۔ چنانچہ اب ان کے ساتھ براہ راست معاملہ کیا جائے گا جس کو ڈاکٹر اسرار احمد نے آخری مرحلہ اور جسمانی ٹکراؤ کا نام دیا ہے۔ اس کو انہوں نے Armed Conflict کہا ہے[1]۔ اس کے نتیجے میں انقلابی جماعت کی کامیابی کے امکانات کتنے ہو سکتے ہیں؟ اس کا جواب ڈاکٹر اسرار احمد کے پاس بھی نہیں ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ: "دو میں سے ایک نتیجہ بہر حال نکلنا ہے اور وہ ہے تخت یا تختہ۔ تیسرا اور کوئی راستہ نہیں ہے[2]"۔

ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ مذہبی اصلاح اور تزکیہ نفس کے لیے کسی قسم کے تصادم کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے تبلیغی مراکز اور خانقاہیں کافی ہیں۔ لیکن اگر نظام بدلنے کا مشن طے کیا جا چکا ہو تو تصادم کے امکانات کو مد نظر رکھنا چاہیے[3]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق ان کے تصورِ انقلاب کے لیے یہ اقدام سیرت النبی ﷺ سے ماخوذ ہے۔ آپ ﷺ نے مدینہ پہنچ کر مسجد نبوی کی تعمیر کی جس میں مسلمانوں کی مشاورتی کونسل کے اجلاس ہوتے تھے اور اس طرح ایک اسلامی مرکز وجود میں آ گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے انصار و مہاجرین کے مابین مواخات کا رشتہ قائم کیا جس سے ان کی جمعیت مستحکم ہو گئی۔ تیسرے مرحلے پر آپ ﷺ نے مدینہ میں موجود یہودیوں کے ساتھ میثاق باندھا جس سے مسلمانوں کی Strategic پوزیشن انتہائی مضبوط ہو گئی۔ آپ ﷺ کے اس عمل کی ٹائن بی اور منٹگمری واٹ نے بہت تعریف کی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ میثاق مدینہ کوئی دستور نہیں تھا بلکہ یہ یہودیوں کے ساتھ مدینہ کے دفاع کا ایک مشترکہ معاہدہ تھا۔ اس کے ذریعے نبی اکرم ﷺ نے ریاست مدینہ کی دفاعی پوزیشن میں استحکام پیدا کر لیا تھا[4]۔

ڈاکٹر اسرار احمد اس حوالے سے تحریک المجاہدین کے امیر سید احمد شہید پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے بھی اسلامی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے طریقہ کار میں بنیادی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اقدامی کاروائی والا قدم سب سے پہلے اٹھا لیا اور پٹھانوں کے علاقوں میں جا کر شریعت کو نافذ کر دیا۔ سید احمد شہید نے اپنی ہجرت اور نبی اکرم ﷺ کی ہجرت پر قیاس کیا اور سمجھا کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد وہاں اسلام کا نفاذ فرمایا تھا اسی طرح میں بھی بریلی سے یہاں آ کر شریعت کا نفاذ کر کے کامیاب ہو جاؤں گا۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسولِ انقلاب کا طریقِ انقلاب، ص27

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی ﷺ، ص20، 21

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، ص17

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسولِ انقلاب کا طریقِ انقلاب، ص47، 48

انہوں نے مقامی آبادی میں دعوت و تبلیغ کے ذریعے اصلاح نہیں کی تھی۔ اسی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں بھی ڈاکٹر اسرار احمد کا گمان ہے کہ، ان سے ایک سیاسی غلطی ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے پہلے کچھ برسوں تک انہوں نے جماعت اسلامی کو ایک انقلابی جماعت کے طور پر چلایا لیکن پھر وہ بھی پاکستان کی سیاسی و جمہوری جماعتوں کی طرح ایک پارٹی کا روپ اختیار کر گئی۔ انہوں نے سوچا کہ سیاست میں آنے کے بعد لوگ ہمیں ووٹ دے کر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچائیں گے اور جب اقتدار ہمارے پاس ہو گا تو پھر ہم خود ہی نظام کو تبدیل کر دیں گے۔ حالانکہ ملک کی فضا ابھی ان کے حق میں تیار نہیں ہوئی تھی اس لیے عوام نے ان کو ووٹ نہیں دیے تھے[1]۔

اس کے بعد آپ ﷺ کے مشرکین مکہ، یہود مدینہ اور دیگر قبائل عرب کے ساتھ کئی عسکری معرکے ہوئے۔ ان جنگوں میں مسلمان بھی شہید ہوئے اور کافر بھی ہلاک ہوئے۔ خود نبی اکرم ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ انقلاب کے اس آخری مرحلے کے بعد فتح مکہ کے کچھ عرصہ بعد آپ ﷺ نے جزیرہ عرب میں اسلام غالب کر دیا تھا[2]۔

کیا تصادم کی راہ اپنانا ضروری ہے؟ اس کے علاوہ کسی دوسری عملی پالیسی کے ذریعے انقلاب کی راہ ہموار نہیں کی جاسکتی ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد لچک کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ اس ضمن میں اجتہاد کی ضرورت ہے کیونکہ عہد نبوی میں ایک طرف مسلمان جب کہ دوسری طرف کافر تھے۔ اس لیے حربی کافر کو قتل کرنے میں مسلمان کو کسی فکری و عملی آزمائش کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے جب کہ اس وقت دونوں طرف مسلمان ہیں۔ حکمران طبقی عملی اعتبار سے جیسا بھی ہے، طہر طور مسلمان ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت سماجی ارتقاء سے گزرتے ہوئے انسان اس مرحلے میں داخل ہو چکا ہے جہاں جنگ لڑے بغیر بھی حالات تبدیل کیے جاسکتے ہیں۔ اب ریاست اور حکومت الگ الگ چیزیں قرار دی گئی ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں اب حکومتوں کی نہیں بلکہ ریاست کی وفاداری پیدا ہو چکی ہے۔ اب الیکشن لڑ کر یا احتجاجی تحریک کے ذریعے حالات بدلنا ممکن ہے۔ انتخابات خواہ کس قدر شفاف ہوں، نظام میں تبدیلی کے لیے مفید نہیں ہے۔ اس سے نظام ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں آجاتا ہے[3]۔

احتجاجی تحریک کے ذریعے بغیر کوئی پر تشدد راہ اختیار کیے، اس انقلاب کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ منکرات کا سدباب کرنے کے لیے دھرنے دے کر اور سودی بینکوں کا گھیراؤ کر کے اس احتجاج کو موثر بنایا جاسکتا ہے۔ یقیناً اس کے بدلے میں ریاستی ادارے حرکت میں آئیں گے اور احتجاجی افراد پر تشدد کیا جائے گا جس کو برداشت کرنا ہو گا۔ پھر تشدد پر اترنے والی افواج ہاتھ کھڑے کر دیں گی اور اپنے ہی عوام کا قتل کرنے سے انکار کر دیں گی۔ اس کی ایک مثال ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں سامنے آئی تھی جب بریگیڈیئر محمد اشرف

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، ص45، 46

2۔ ایضاً، ص53، 52

3۔ ایضاً، ص58، 59

گوندل نے اعلان کر دیا کہ اب ہم لوگوں پر مزید گولیاں نہیں چلائیں گے۔ اس سے بھٹو کو پیغام مل گیا کہ فوج اپنی قوم کی محافظ ہے[1]۔

اقدامی کاروائی کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد تشدد کی راہ اپنانے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ اس سے کوئی انقلاب برپا نہیں ہوتا بلکہ انارکی پھیلتی ہے اور انسانی جانوں کا ضیاع ہوتا ہے۔ کشمیر میں لاتعداد لوگ شہید ہو چکے ہیں لیکن اس عسکری تصادم کا تاحال کوئی نتیجہ سامنے نہیں آسکا ہے۔ اگر کسی سرکاری عمارت کو انقلابی جوش میں تباہ کر دیا جائے تو اس سے محض عوام کی ہلاکت سامنے آئے گی۔ اس سے غصہ تو نکل سکے گا لیکن کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا[2]۔

یہاں ڈاکٹر اسرار احمد کے تصور انقلاب میں تعارض اور تضاد نظر آتا ہے کیونکہ ایک مقام پر وہ تصادم کی راہ تجویز کر رہے ہیں جب کہ بعد میں وہ تصادم سے احتراز کی بات کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کا تصورِ انقلاب ابھی تشکیلی مراحل میں تھا۔ اس تضاد میں ایک تطبیق یہ بھی دی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے اولین مراحل میں تصادم کا موقف اپنایا تھا لیکن وہ دیکھ رہے تھے کہ جن مذہبی گروہوں کی جانب سے تصادم کی راہ اپنائی گئی تھی وہ اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام ہو گئی تھیں۔ لال مسجد اسلام آباد والا واقعہ بھی اسی ضمن میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے بعد میں ڈاکٹر اسرار احمد نے تصادم کے بجائے احتجاج کو تجویز کرتے ہیں۔

6۔ توسیعی و تصدیری مرحلہ

نظریہ جب انقلاب پیدا کر دے تو اس کا ایک خاصہ یہ بھی سامنے آتا ہے کہ وہ قومی اور جغرافیائی حدود میں مقید نہیں رہتا ہے۔ وہ سرحدوں کے موانعات کو پار کر کے دوسرے ممالک اور ریاستوں میں بھی اپنی جڑیں پھیلا دیتا ہے[3]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ ملکی سطح پر اسلام کے نفاذ کے بعد اگلا مرحلہ بین الاقوامی سطح پر اسلام کو غالب کرنے کا ہے۔ یہ بھی نبی ﷺ کی سیرت سے ماخوذ ہے۔ ہجرت مدینہ کے بعد آپ ﷺ چاہتے تو دیگر ممالک کے حکمرانوں کو دعوتی خط لکھ سکتے تھے لیکن آپ نے مدینہ میں اسلام کو نافذ کیا اور پھر عرب پر اسلام کا جھنڈا غالب کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے غیر مسلم حکمرانوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے بدلے میں مختلف قسم کے ردعمل سامنے آئے۔ بعض لوگوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا اور بعض حکمرانوں نے اس کو مسترد کر دیا۔ آپ ﷺ کے پیغام کے بدلے میں کئی حکمرانوں نے شدت پسندی کی راہ بھی اپنائی تھی۔ اس کی ایک

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، ص60

2۔ ایضاً، ص62، 61

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، ص21

مثال ہر قل کے گورنر ملک غسان کا آپ ﷺ کے سفیر حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہید کرنا تھا۔ آپ ﷺ کی زندگی میں بھی تصدیرِ و توسیعِ انقلاب کا عمل شروع ہو گیا تھا[1]۔

ڈاکٹر اسرار کے مطابق التزام جماعت پر عمل کرنے سے اسلامی انقلاب کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعے دعوت، احتجاج یا تصادم تینوں صورتوں کا سامنا کرنے کی تیاری کی جاسکتی ہے البتہ اس کام انقلاب کے عمل میں آن جانے کے بعد اس کی توسیع کا ہے جس کے بعد اسلام کا کل عالم پر غلبہ پا جانے کا ایک نیا سفر شروع ہو جاتا ہے۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، ص55

فصل دوم

اسلامی ریاست کی معاشی و معاشرتی بنیادیں

اپنے خطبات اور کتابچوں میں ڈاکٹر اسرار احمد نے معاشی مسائل پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات کی صورت میں سامنے آنے والے افکار میں جاگیر دارانہ نظام، مزارعت، اشتراکی نظام، سرمایہ دارانہ نظام اور مروجہ بنکاری کے نظام وغیرہ مذکور ہیں۔

معاشی نظام کا مادی اور روحانی پہلو

ادیان و مذاہب میں معاشی ضابطہ حیات کے حوالے سے عموماً بہت کم معلومات میسر ہیں۔ بعض مذاہب تصورِ اکتساب کی نفی پر بھی مشتمل ہیں۔ معیشت کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اصولی موقف یہ ہے کہ دیگر مذاہب کے مطابق اس کا تعلق دین کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اپنی نوعیت میں یہ ایک سیکولر مسئلہ ہے[1]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس کو سیکولر مسئلہ اس لیے کہا ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کا تعلق دین کے ساتھ نہیں ہے بلکہ یہ روزمرہ زندگی کا ایک ایسا عنصر کا جس تعلق انسانی تعامل کے ساتھ ہے۔ سیکولر قرار دینے کے باوجود ڈاکٹر موصوف نے اس کو دین کے ساتھ مربوط کر کے اس کی روحانی اساس پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کی ایک دلیل پیش کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ جب قسطنطین نے عیسائیت کو قبول کیا تب روم دنیا کے تین براعظموں پر پھیلا ہوا تھا۔ پوری کی پوری سلطنت عیسائی ہو گئی لیکن اس مذہبی تبدیلی نے روم کے معاشی نظام میں کوئی انقلاب برپا نہیں کیا تھا[2]۔ یہ سیکولر مسئلہ تھا اس لیے 1917ء میں آنے والا بالشویک کا انقلاب محض معاشی ثابت ہوا اور اس کے بعد تمام اثاثے قومی تحویل میں لے لیے گئے تھے اور مذہب پر اس انقلاب کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا[3]۔ دوسری جانب اسلام میں توحید کا تصور براہ راست انسانی زندگی کے تین پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان میں سیاست، معیشت اور سماج شامل ہیں[4]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام، دونوں کو مادیت پرستانہ معاشی نظام قرار دیا ہے کیونکہ یہ دونوں ہی روحانی اقدار سے خالی ہیں[5]۔ سرمایہ دارانہ نظام کا نعرہ "آزادی" جب کہ اشتراکی نظام کا نعرہ

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسولِ انقلاب کا طریق انقلاب، ص9

2۔ ایضاً، ص10

3۔ ایضاً، ص11

4۔ ایضاً، ص33

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام کا معاشی نظام، (مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور)، ص9

"مساوات" ہے۔ ان دونوں کے مقابلے میں اسلام کا نعرہ انصاف ہے اور اسلام مساوات اور آزادی دونوں کو عدل کا پابند کرتا ہے تاکہ نہ تو آزادی اپنی حدود کو پھلانگ سکے اور نہ مساوات کی بنا پر کسی کا حق سلب کیا جا سکے[1]۔

اسلامی ریاست کے معاشی نظام کو ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے لکھا ہے کہ اس کے اندر اشتراکیت کے اصولوں کو اخلاقی اور روحانی سطح پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے جملہ پہلوؤں میں یہ حقیقت شامل ہے کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ یہ کسی فرد یا ادارے کی ملکیت نہیں ہے اور نہ ہی اس کو قومی ملکیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسلامی معیشت کے اس اشتراکی پہلو کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ اس کو محض رضاکارانہ سطح پر رکھا جا سکتا ہے اور اس کی حیثیت اختیاری ہے۔ قانونی اعتبار سے اس کو مسلط نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے زندگی بھر زکوٰۃ نہیں دی تھی کیونکہ آپ ﷺ کے پاس نصاب ہی جمع نہیں ہو پاتا تھا اس لیے زکوٰۃ کو روحانی اشتراکیت کا ایک ایسا مقدمہ قرار دیا جا سکتا ہے جو بعد میں کارل مارکس کے نظریات میں مادی فکر کے روپ میں پیش کیا گیا تھا[2]۔

بعد کے زمانوں میں جب ملوکیت نے قبضہ جمایا اور اسلام کی زمام کار بادشاہوں کے ہاتھ میں آگئی تو ان کی مادیت پرستانہ سوچ اور حرص و ہوس پر مشتمل مزاج نے اسلام کے اس روحانی و اخلاقی پہلو کو مادی اور قانونی شکل دے دی جس کی وجہ سے لوگ اسلام کی جانب قدم بڑھانے کے بجائے اس سے متنفر ہونے لگے تھے[3]۔

سرمایہ دارانہ نظام کی خوبیاں

ڈاکٹر اسرار احمد نے سرمایہ دارانہ نظام کے بھی ان پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جن کی وجہ سے سخت مخالفت کے باوجود یہ نظام دنیا میں نہ صرف تاحال قائم ہے بلکہ روز افزوں اس کی مقبولیت میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ ان مثبت پہلوؤں میں پہلی چیز یہ ہے کہ اس میں لامتناہی نجی ملکیت کا تصور موجود ہے۔ اس نظام کے تحت فرد یا ادارہ کسی بھی چیز کا مالک بننے میں آزاد ہے۔ یہ چیز عام استعمال کی ہو سکتی ہے اور اسی طرح اس چیز کا تعلق ذرائع پیداوار کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نظام کا بنیادی اصول ہی ذاتی ملکیت ہے اس لیے افراد اور اقوام دونوں میں اس کی مقبولیت کا گراف بڑھ رہا ہے۔ اس میں ہر شخص کو اس کی ذاتی محنت کی بنا پر آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ جو جتنی محنت کرے گا اس کے لیے معاشی آسودگی کے امکانات اسی طرح بڑھتے جائیں گے۔

1۔ ایضاً، ص 11، 12

2۔ خلافت کی حقیقیت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص: 117

3۔ ایضاً، ص: 117

ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ اشتراکیت کی ناکامی میں یہی ایک عنصر موجود تھا جس کے مطابق ہر شخص کو ذاتی ترغیب دینے والا محرک نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ فطری طور پر ہر فرد کے ذہن میں یہی سوچ پیدا ہو چکی تھی کہ میں جتنا بھی کام کروں گا اس کے بدلے میں مجھے ایک معین تنخواہ ملے گی۔ جن کمپنیوں کو پاکستان میں قومیالیا گیا تھا ان کی ناکامی کے پیچھے بھی یہی وجہ تھی۔ جس شخص کا ذاتی کارخانہ ہو وہ راتیں جاگ جاگ کر کام کرتا اور کرواتا ہے جس سے کارخانے کو ترقی اور عروج ملتا ہے۔ دوسری جانب اگر اس کو قومی تحویل میں لے کر اس پر ایک جنرل مینجر کو تنخواہ پر رکھ لیا جائے تو اس کو محض تنخواہ سے غرض ہوتی ہے اور اس کا ذاتی مفاد کارخانے کے ساتھ وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے اس کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کارخانہ نفع میں جارہا ہے یا نقصان میں جارہا ہے[1]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے سرمایہ دارانہ نظام کی ایک خوبی یہ بھی بیان کی ہے اس کے مطابق رسد کی زیادتی سے طلب اور قیمت کم ہو جاتی ہے جب کہ رسد کی کمی کے سبب طلب اور قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے ہوتے ہوئے حکومتوں کو مصنوعی طور پر چیزوں کی قیمتوں پر قابو پانے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ اگر اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جائے تو اس کے نتیجے میں تاجروں کے کردار میں بے ایمانی پیدا ہو جاتی ہے[2]۔

سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی کا تیسرا سبب Hire and Fire والی پالیسی ہے۔ ضرورت کے وقت کسی شخص کی خدمات کو خریدنا اور ضرورت پوری ہو جانے کے بعد اس شخص کی خدمات کو معطل کر دینا سرمایہ دارانہ نظام میں عین جائز ہے۔ اس میں صرف خدمات حاصل کرنے والا ہی آزاد نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی رو وہ خدمات پیش کرنے والا شخص یا ادارہ بھی معاوضہ متعین کرنے یا کام کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ دو طرفہ معاشی آزادی کا عکاس و غماز ثابت ہوتا ہے[3]۔

سرمایہ کاری اور سرمایہ داری

ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ اسلام نے ہمیں سرمائے کے حوالے سے جس نظام کی ترغیب دی ہے وہ سرمایہ کاری کا نظام ہے، سرمایہ داری نظام نہیں ہے۔ سرمایہ کاری کا نظام یہ ہے کہ ایک شخص منڈی میں آئے اور سرمایہ لگا کر تجارت کرے۔ اس کا منافع اس کی جیب میں جائے گا۔ سرمایہ داری یہ ہے کہ کوئی فرد محض فائدہ حاصل کرنے کے لالچ میں نہ تو کوئی محنت کرے اور نہ ہی نقصان میں شریک ہونے کا متمنی ہو۔ اس کے نتیجے میں دولت کا ارتکاز عمل میں آتا ہے جس سے قرآن مجید نے منع فرمایا ہے[4]۔ دولت کے ارتکاز کے

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقیت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص:118

2۔ ایضاً

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقیت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص:119

4۔ الحشر:7

نتیجے میں انسان طبقات کی منقسم ہو جاتے ہیں جن کو قرآن مجید میں "مترفین[1](haves)" اور "محرومین[2](have-nots)" کہا گیا ہے[3]۔

ہر معاشی منظر نامہ تین امور پر مشتمل ہوتا ہے:

(1)سرمایہ

(2)محنت

(3)موقع

کسی مخصوص وقت اور جگہ پر سرمایہ لگانے سے نفع زیادہ ملتا ہے جب کہ دوسرے وقت پر سرمایہ لگانے سے کم نفع حاصل ہوتا ہے۔ اس کو چانس کہا جاتا ہے اور اسی سے مترفین کا طبقہ بنتا ہے[4]۔ چونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں زیادہ توجہ محنت کے بجائے سرمایہ دار کے سرمائے کی حفاظت پر ہوتی ہے اس لیے یہ اسلامی نظامِ معیشت سے متصادم ہے کیونکہ اسلام نے محنت پر زیادہ زور دیا ہے۔ دوسری جانب سرمایہ کار جب محض چانس کی بنیاد پر کمائی کا پل بن جائے تو یہ بھی اسلام سے متصادم ہو جائے گا[5]۔

لہذا سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح کی ضرورت ہے اور یہ اصلاح تین چیزوں میں ہونی چاہیے

(1)سود کا خاتمہ

(2)جوا

(3)جاگیر داری / غیر حاضر زمین داری[6]

جاگیر داری کو ڈاکٹر اسرار ایک فتنہ سمجھتے ہیں اور انہوں نے اس کا خاتمہ کرنے پر بھرپور زور دیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ اس کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح یہ موقف اپنانا چاہیے کہ کسی بھی خطے کی زمین فاتح مجاہدین یا سرمایہ داروں میں تقسیم نہیں کیا جائے گی[7]۔

1۔ مترفین: سرمایہ دار، ناز پروردہ، آسودہ حال، اتراف سے اسم مفعول جمع مذکر بحالت نصب۔(ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، قرآن مجید کا عربی اردو لغت، ص: 465، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2001ء)

2۔ محروم، نایافتہ، بے نصیب، بدنصیب (ایضاً، ص:470)

3۔ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت، ص:120

4۔ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت، ص:120

5۔ایضاً

6۔ایضاً، ص:123

7۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ " ہمارے ہاں جاگیر داری کی جو مصیبت ہے اسے شمشیر فاروقی ہی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔"۔(خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام، ص:126)

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق اس اصلاحی عمل کے ضمن میں سرمایہ کاری تین طریقوں سے ہو سکتی ہے۔

(1) انسان اپنا سرمایہ لگا کر اس پر خود محنت کرے۔

(2) ایک سے زیادہ لوگ کسی ایک کام میں مل کر سرمایہ کاری کریں اور مشترکہ محنت کریں۔ یہ شراکت کہلاتی ہے البتہ اس میں ایک شرط یہ ہے کہ اس میں کسی بھی فرد کی محدود ذمہ داری نہیں ہونی چاہیے۔ اسی کی وجہ سے دنیا میں تجارتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ لوگ سرمایہ لگانے کے بعد اس کو نکال کر اپنے اثاثے بنا لیتے ہیں جس کے بعد کمپنی کو دیوالیہ قرار دیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کی ادائیگیاں کرنی ہوں وہ مسائل میں گھر جاتے ہیں۔ وہ سرمایہ دار کی ذاتی پراپرٹی سے اپنا حق وصول کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ دوسری جانب شراکتی تجارت کے نظام میں سب پر مساوی ذمہ داری عائد ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ پاکستان میں لوگ پہلے کاروبار لگاتے ہیں اور پھر صنعت کے نام پر بینکوں سے بھاری قرضے لے لیتے ہیں۔ اس قرض کی رقم سے اپنا سرمایہ نکال لیتے ہیں اور پھر سارا بوجھ بینک پر آ جاتا ہے۔ بینکوں میں لوگوں کے ہی پیسے پڑے ہوتے ہیں اس لیے نقصان عوام الناس کا ہوتا ہے۔ دوسری جانب شراکت کا تصور یہ ہے کہ دو لوگ کاروبار میں شریک ہوں اور اگر اس میں کوئی نقصان ہو تو دونوں اس کے ذمہ دار ہوں[1]۔

(3) تیسری صورت میں ایک فرد کا سرمایہ جب کہ دوسرے فرد کی محنت ہوتی ہے۔ اس کو اسلامی اصطلاح میں مضاربت کہا جاتا ہے[2]۔ اس پر یہ سوال کھڑا کیا جا سکتا ہے کہ مضاربت بھی سرمایہ دار کو محنت کے بغیر نفع ہی پہنچاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے اصل اہمیت سرمائے کی نہیں بلکہ محنت کی ہے۔ مضاربت کی صورت میں اگر نقصان ہو تو وہ سرمایہ دار کو ہی ہو گا اور اس کے ذریعے سرمایہ دارانہ مروجہ نظام کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اسی لیے سرمایہ دار مضاربت پر تیار نہیں ہوتے ہیں

مزید لکھتے ہیں کہ "جاگیر داری کا خاتمہ کوئی آسان کام نہیں ہے' یہ گویا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا ہے۔ وہ مراعات یافتہ طبقہ جس کی آج خدائی نافذ ہے' اس کی خدائی چھین لینا آسان کام نہیں ہے۔" (ایضاً، ص:156)۔

وہ اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ:" افسوس کہ جب مسلمانوں کے دورِ زوال میں اس پر ملوکیت کے ساتھ ساتھ جاگیر داری اور سرمایہ داری کی چھاپ پڑ گئی تو اسلام اور قرآن کے رخِ روشن کی یہ جہاں تابیاں نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں"۔(علامہ اقبال اور ہم، ص:95)

1۔ ایضاً، ص:119

2۔ مضاربت سے مراد ایسی تجارت ہے جس میں سرمایہ ایک شخص کا اور محنت کسی دوسرے شخص کی ہو اس شرط پر کہ منافع دونوں میں طے شدہ شرائط کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔ تجارت کے خسارے میں نقصان صرف مال کے مالک کا ہو گا اور عامل کو اپنی محنت و جدوجہد کا نقصان ہو گا۔(ڈاکٹر حافظ عمران ایوب، فقہ الاسلام شرح بلوغ المرام، (فقہ الحدیث پبلی کیشنز، لاہور، 2006ء)، ص:521)

کیونکہ اس میں فریقین کے لیے نفع برابر ہوتا ہے۔ اسلام میں محض سرمایہ لگانے کی بنیاد پر کسی کو معین منافع نہیں دیا جاسکتا ہے[1]۔

مروجہ نظامِ مزارعت

حنفی فقہا کے مطابق مزارعت سے مراد ہے "عقد علی الزرع ببعض الخارج "کاشت کاری کا وہ معاہدہ جس کے مطابق زمین کے بدلے میں پیداوار کا ایک حصہ ہے[2]"۔

حنفی مصادرِ فقہ کے مطابق امام ابو حنیفہ مزارعت کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے مزارعت اور مساقات کو ہر صورت میں ناجائز قرار دیا تھا۔ ان کے موقف کے مطابق مزارعت باغات اور زمین دونوں میں ناجائز ہے[3]۔

امام موصوف کے مطابق اگر مزارعت کا کوئی معاہدہ ہو جائے تو لازم ہے کہ اس معاہدے کو فسخ کر کے مزدور کو رواج کے مطابق اس کے کام کا معاوضہ دیا جائے[4]۔ قاضی ابو یوسف کے مطابق امام ابو حنیفہ نے اس کی توضیح یہ پیش کی کہ مزارعت میں ایک شخص دوسرے فرد کو مجہول اجرت پر اجیر بنالیتا ہے۔ "فان ابا حنیفۃ کان یقول ھذا کلہ باطل "امام ابو حنیفہ کہا کرتے تھے کہ یہ مکمل طور پر باطل ہے[5]۔

امام مالک بھی مزارعت کو جائز نہیں سمجھتے تھے، ان کے نزدیک خالی زمین کسی کو دے کر پیداوار کا ایک حصہ وصول کرنا مکروہ ہے[6]۔ موطا امام مالک کی شرح میں علامہ محمد زرقانی نے امام مالک کے مکروہ قرار دینے کو "حرام" کے معانی میں لیا ہے۔ امام مالک کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں نبی ﷺ نے مخابرہ سے منع فرمایا ہے۔ مخابرہ سے مراد زمین کو کرائے پر دے کر اس کی پیداوار کا ایک حصہ لینا ہے۔ یہ مزارعت کی ہی ایک صورت ہے[7]۔

امام شافعی کے مطابق بھی مزارعت ایک ناجائز اور باطل کام ہے البتہ ان کے نزدیک باغ کی مساقات جائز ہے۔ انہوں نے بھی مخابرہ کی ممانعت والی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے مزارعت کو حرام جب کہ مساقات کو

1۔ ایضاً، ص123

2۔ المنجد، ص 298

3۔ قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، (الجامعۃ السلفیۃ المحمدیۃ، قاہرہ، 1967ء)، ص88

4۔ قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، ص91

5۔ قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، ص42، 41

6۔ مالک، مالک بن انس، الموطا، (میر محمد کتب خانہ، کراچی)، ص294

7۔ علامہ ابن رشد مالکی، بدایۃ المجتہد، ص2/210

جائز سمجھا ہے[1]۔امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے مابین اس حوالے سے اختلاف مساقات میں ہے، مزارعت میں نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل کا موقف تھا کہ اگر زمین اور اس میں کاشت کیا جانے والا تخم دونوں زمین کے مالک کے ہوں تو یہ مزارعت کی جائز شکل ہے۔یہ مخابرہ میں شمار نہیں ہو سکتی ہے[2]۔

دوسری جانب امام ابو حنیفہ کے دو شاگرد امام محمد الشیبانی اور قاضی ابو یوسف مزارعت کے قائل تھے[3]۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی کے مطابق بھی مزارعت جائز ہے[4]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے مروجہ مزارعت کے نظام کو بھی اسلامی اصولوں کے خلاف قرار دیا ہے۔ان کا موقف ہے کہ اسلام میں جاگیر داری کا کوئی تصور نہیں ہے۔اگر کوئی شخص اپنی زمین پر محنت کرے تو اس سے حاصل ہونے والی کمائی اس کے لیے حلال ہے۔لیکن جب زمین ایک شخص کی ہو اور اس پر محنت دوسرا کرے تو ضروری ہے کہ زمین اور محنت دونوں کو جمع کر کے شراکت کا ماحول بنایا جائے۔اس میں فریقین کو آزاد رکھا جائے اور کسی کو بھی جبر کا سامنانہ کرنا پڑے[5]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق غریب ممالک کے عوام مروجہ مزارعت کی وجہ سے معاشی آسودگی سے دور ہیں۔ پاکستان کی زمینیں اصل میں خراجی ہیں اور خراجی زمینوں کی بہت زیادہ مقدار فرد واحد کی ملکیت میں نہیں دی جا سکتی ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی اجتہاد تھا۔ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق زمین کی دو اہم اقسام ہیں:

(1) جس زمین کے مالک بغیر کسی عسکری تصادم کے ایمان لے آئین وہ زمین ان کی ملکیت میں ہی رہے گی۔ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کا عشر ادا کرنا ان پر فرض ہے۔مدینہ منورہ کی زرعی زمینیں اسی قسم میں شامل تھیں کیونکہ آپ ﷺ نے مدینہ کو فتح نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ کو اہل مدینہ نے خود وہاں آنے کی دعوت دی تھی۔اس طرح کی زمینوں کو اگر مصنوعی آبپاشی کے ذریعے چلایا جائے تو ان پر پانچ فیصد جب کہ قدرتی آبپاشی کی صورت میں دس فیصد عشر عائد ہو گا[6]۔

1۔شافعی، محمد بن ادریس الشافعی، کتاب الام، ص:7/101،102

2۔علامہ ابن قدامہ، المغنی، باب المزارعۃ، ص:5/244

3۔تفصیل کے لیے دیکھیے، علامہ محمد طاسین، اسلامی اقتصاد کے چند پوشیدہ گوشے، ص:160

4۔سید ابو الاعلیٰ مودودی، مسئلہ ملکیت زمین، (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 2007)، ص:53

5۔ایضاً، ص:124

6۔مودودی، مسئلہ ملکیت زمین، ص:129

(2)زمین کی دوسری قسم خراجی کہلاتی ہے اور اس قسم کی زمینیں جہاد کے ذریعے فتح کی جاتی ہیں۔ ان کو اسلامی ریاست اپنی تحویل میں لے لیتی ہے اور ان کے سابقہ مالکان کی حیثیت کاشت کاروں کی رہ جاتی ہے۔ وہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کا خراج خود مسلمانوں کے بیت المال میں جمع کروانے کے پابند ہوتے ہیں۔ اس خراج کی مقدار اسلامی ریاست کی قانون ساز کمیٹی طے کرے گی[1]۔

یہ ملحوظ رہے کہ سید ابو الاعلیٰ مودودی کے مطابق زمین پر انسانی ملکیت کی ممانعت کے ضمن میں کوئی نص واقع نہیں ہوئی ہے۔ کوئی بھی فرد اپنی بساط کے مطابق زمین خرید کر اس کا مالک بن سکتا ہے۔ یہاں ان کے نقطہ نظر کے ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف موافق نہیں ہے۔ سید مودودی لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل بھی لوگ زمینوں کے مالک ہوا کرتے تھے اور اسلام نے بھی اس کو جائز رکھا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے عدم جواز کا دعوے دار ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہم سے اس کی دلیل مانگنے کے بجائے خود دلیل پیش کرے[2]۔

انسان زمین کو یا تو سکونت کے لیے استعمال کرتا ہے یا زراعت کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ان دونوں صورتوں کے حوالے سے اسلام نے شخصی زمین کو تسلیم کیا ہے[3]۔

دوسری جانب ڈاکٹر اسرار احمد زمین کے اس جاگیر دارانہ نظام کو اسلامی معاشی نظام کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں اور ان کو موقف ہے کہ یہ دورِ ملوکیت کی دین ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بنو عباس کے دور میں ملوکیت نے مضبوط جڑیں پکڑیں۔ اس دور میں پہلی خرابی یہ پیدا ہوئی کہ خلافت کو شورائی کے بجائے موروثی بنا دیا گیا تھا۔ دوسری خرابی معاشی نظام میں پیدا ہوئی تھی۔ بادشاہی نظام کے لیے زمین داری پاؤں کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے ملوکیت کے عہد میں زمین داروں کو بڑے بڑے رقبے دیے گئے تھے[4]۔

پیچھے بیان کردہ حنفی فقہاء(امام محمد الشیبانی اور قاضی ابو یوسف)کا مروجہ مزارعت سے متعلق اجتہاد ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک نظریہ ضرورت کی مجبوری کے تحت تھا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بادشاہت نے اسلامی فقہ کو بھی متاثر کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ نے قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کرنے کے بجائے سختیاں جھیلنا گوارا کر لیں لیکن ان کے شاگرد قاضی ابو یوسف نے اس منصب کو حالات کا تقاضا یا مصلحت سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ قاضی ابو یوسف نے منصب تو قبول کر لیا لیکن معاشی نظام میں پیدا ہو چکی برائی کو دور کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے چند شرائط کے ساتھ مزارعت کو جائز قرار دیا۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ زراعت کے لیے بیج مالک مہیا کرے گا اور اس کے

1۔ ایضاً، ص:132

2۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، معاشیاتِ اسلام، (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور 2013ء)، ص:154

3۔ مودودی، معاشیاتِ اسلام ایضاً، ص:154

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت، ص:133

علاوہ فلاں فلاں چیز بھی وہی مہیا کرے گا تا کہ اگر نقصان ہو تو اس میں زمین دار بھی شریک ہو، صرف محنت کرنے والا نقصان سے دوچار نہ ہو[1]۔ نظریہ کی ایک مثال ڈاکٹر اسرار احمد نے یہ بھی بیان کی ہے کہ بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں ملوکیت چھا گئی اور اس کا سدباب کرنے کے تمام طریقے ناکام ہو گئے تو فقہا نے متغلب ملک کی حکومت کو قبول کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا تھا۔ اس لیے فتنہ و فساد اور انسانی جانوں کے ضیاع کے خوف سے نظریہ ضرورت کے تحت اس کو جائز قرار دیا تھا۔ زمین کا سود بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے[2]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستان اور بھارت کا موازنہ کرتے ہوئے اس امر پر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ تقسیم برصغیر کے بعد بھارت نے جلد ہی جاگیر داری سے بھی آزادی حاصل کر لی تھی۔ علامہ اقبال اور قائد اعظم دونوں ہی اس سے نجات چاہتے تھے لیکن افسوس کہ پاکستان میں جاگیر داری تا حال قائم ہے[3]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد اور سید مودودی کے ہاں مزارعت کے بارے میں اصولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ سید مودودی نے اس کو کلی طور پر جائز قرار دیا ہے جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق یہ علما نے یہ جواز بامر مجبوری پیش کیا تھا، اس کو شرعی حکم کے طور پر نافذ نہیں کیا گیا تھا۔

اسلامی ریاست میں ٹیکس کا نظام

حکومت کی جانب سے عوام پر لاگو کیا گیا لازمی مطالبہ برائے ادائیگی ٹیکس یا محصول کہلاتا ہے[4]۔ ملکی ضروریات پوری کرنے کے لیے حکومت اپنے عوام سے جو رقم وصول کرتی ہے اصطلاح میں اس کو ٹیکس کہا جاتا ہے۔ یہ رقم ادا نہ کرنے والوں کے خلاف قانونی اقدام کیا جاتا ہے.

ریاستی امور بیت المال کے ذریعے چلائے جاتے ہیں جس میں موجود خزانے کے ذریعے ملک کے اخراجات کو پورا کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے عوام کی کفالت کا نظام بھی چلتا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کا موقف ہے کہ اسلامی ریاست میں صرف ان لوگوں سے ٹیکس جمع کر کے بیت المال میں رکھا جائے جن کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ مال ہے۔ ان کے مال کے صرف اس حصے پر ٹیکس لاگو کرنا چاہیے جو ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد بچ جاتا ہے[5]۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت، ص:133

2۔ ایضاً

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام میں عدل اجتماعی، (مکتبہ خدام القرآن، لاہور، 2001ء)، ص:22

4. Encyclopedia Britannica, (1968), vol، 21, P۔ 723

Dolton, Principle of Public finance, London,(1940), P.26.3.

International Encyclopedia of Social Sciences,(1974), vol 15, P. 521.

5۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، قرآن کی معاشی تعلیمات، (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 1997ء)، ص:64

ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ چونکہ اسلامی ریاست نظریاتی اصولوں پر کھڑی ہوتی ہے اس لیے اس کے باشندوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ اسی اعتبار سے ان سے ٹیکس بھی لیا جائے گا۔ بعض محاصل ایسے ہیں جن کی ادائیگی محض مسلمانوں پر ہے اور غیر مسلم ان سے مستثنیٰ ہیں۔ بعض محاصل غیر مسلموں پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ مسلمان نقدی اور تجارت کے اموال پر اڑھائی فیصد زکوٰۃ دینے کے پابند ہیں۔ اسی طرح زرعی اراضی کا عشر بھی ان پر لاگو ہو گا۔ یہ دونوں اپنے مزاج کے اعتبار سے ٹیکس ہیں لیکن ان کی ایک روحانی حیثیت عبادت کی بھی ہے۔ غیر مسلمانوں سے جزیہ وصول کیا جائے گا۔ ان کی زمینوں کا خراج بھی لیا جائے گا۔ ان دونوں کو خالصتا ٹیکس ہی سمجھا جائے گا اسی لیے ان کی کوئی خاص شرح متعین نہیں ہے۔ حکومتِ وقت اس کا تعین کر سکتی ہے۔ اس ٹیکس کی مدد سے مملکت کے جملہ امور سرانجام دیے جاسکتے ہیں[1]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق مال کی دو اقسام ہیں:

(1)اموال ظاہرہ: وہ تجارتی سامان جو دکان یا گودام میں پڑا ہوتا ہے۔ مویشی بھی اس میں شامل ہیں۔ کارخانے میں موجود مصنوعات پر بھی اسلامی ریاست میں زکوٰۃ عائد ہوتی ہے اور اگر کوئی اس کی ادائیگی نہیں کرتا تو اس سے جبرا وصول کی جائے گی۔ اسلامی ریاست میں عوام کی بنیادی ضروریات کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ اس فریضہ سے عہدہ براہ ہونے کے لیے حکومت جبرا بھی زکوٰۃ وصول کر سکتی ہے[2]۔

(2)اموال باطنہ: کسی مشکل وقت سے نبرد آزما ہونے کے لیے زیور یا نقدی کی صورت میں گئے مال کو اموالِ باطنہ کہا جاتا ہے۔ حکومت اس مال کی نہ تو تلاشی لے سکتی ہے اور نہ ہی اس پر جبری زکوٰۃ وصول کر سکتی ہے۔ یہ انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کا معاملہ ہے۔ مسلمان اس مال کے حوالے سے ریاست کو زکوٰۃ ادا کرنے یا اپنے طور پر کسی مستحق کو زکوٰۃ دینے میں آزاد ہے۔ یہی وہ اموال باطنہ تھے جن میں سے زکوٰۃ نکال کر خلافت کے دور میں لوگ پھرتے تھے لیکن اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ تھا[3]۔

فقہ اسلامی میں ضرائب اور نوائب کے نام سے بھی کئی ٹیکسوں کا تذکرہ موجود ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کیا جاتا ہے:

﴿فَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ﴾[4]

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام کا معاشی نظام اور اسلامی ریاست کا نظامِ محاصل، (مکتبہ خدام القرآن، لاہور)، ص 71

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت، ص 140

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت، ص 141

4۔ الروم: 38

ترجمہ: پس قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾[1]

ترجمہ: اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محروم کے لیے ایک حصہ تھا۔

﴿وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾[2]

ترجمہ: اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں، کہہ دے جو بہترین ہو۔

انہی آیات کے ضمن میں امام قرطبی نے لکھا ہے کہ اگر مسلمانوں کو مالی بحران کا سامنا ہو تو امراء پر زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بھی خرچ کرنا واجب ہے[3]۔ امام رازی نے اس ضمن میں حکمران کے لیے زبردستی کرنا بھی جائز قرار دیا ہے[4]۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے یہ اصطلاحات تو استعمال نہیں کیں لیکن ان کے معاشی افکار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ضرائب اور نوائب کے قائل ہیں۔

اسلامی ریاست میں بینکاری

عصر حاضر میں بینک کاری انتہائی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ دنیا ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے اور کوئی بھی ملک دنیا سے کٹ کر اپنا معاشی نظام نہیں چلا سکتا ہے۔ اس لیے بین الاقوامی معیشت میں بینک کاری کے ذریعے ترقی لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بینک کاری کا جدید نظام سرمایہ سے سرمایہ بنانے کی پالیسی پر چلتا ہے۔ اس کے لین دین میں سود ایک جزو لاینفک کے طور پر بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ چونکہ اس وقت یہ نظام انتہائی مضبوط جڑیں پکڑ چکا ہے اور پوری دنیا میں چل رہا ہے اس لیے بعض مسلمان علما نے کچھ شرائط کے ساتھ اس کے جائز ہونے کا فتویٰ دے دیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس کے جواز کی صورتیں صرف اس وقت نکل سکیں گی جب اس کی فکری و نظریاتی بنیاد درست ہو گی۔ اگر اس میں سرمائے کے بجائے محنت اور سود کے بجائے اسلام کی اقدار کو ترجیح دی جائے تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی بینکاری کا تصور اصل میں حیلے کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ اس کو بیع مؤجل اور بیع مرابحہ کے اصولوں کے تحت چلایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ بیع موجل کی صورت میں سود کے ساتھ قرض لینے کے بارے میں ہمارے ہاں جواز کا فتویٰ جرور دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ سود ہونے کی بنا پر جائز نہیں ہو سکتا ہے / اسی طرح نقد اور اقساط کی صورت میں ایک چیز کی دو قیمتوں کو بھی سود کے ضمن میں ہی شمار کیا جائے گا۔ لیکن چونکہ اب اس

1۔ الزاریات:19

2۔ البقرہ:219

3۔ قرطبی، محمد بن احمد القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1985ء)، زیر آیت البقرہ ص:2/240

4۔ فخر الدین الرازی، مفاتیح الغیب، (دار الفکر، بیروت، 1990ء)، زیر آیت البقرہ ص:5/177

طریقہ تجارت کا رواج چل پڑا ہے اس لیے اس کو جائز قرار دیا گیا ہے اور اسی طرح کے حیلوں کی بنیاد پر لوگوں نے بیع مؤجل کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے[1]۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی چیز کے مروج ہو جانے کی بنیاد پر اس کی حلت اور مشروعیت کا فتویٰ دیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں ڈاکٹر محمد عزیز لکھتے ہیں کہ اسلام نے معاملات کے حوالے سے اصول وضوابط بتا کر ان کی جزئیات کو انسان کے تجربے اور اس کی عقل پر چھوڑ دیا ہے تا کہ شریعت کے امور میں لچک باقی رہے۔ ہر زمانے کے لوگ ان اصولوں کی روشنی میں اپنے معاملات کے بارے میں پالیسی سازی کر سکتے ہیں[2]۔

فقہ اسلامی میں عبادات کا حصہ معاملات کے حصے سے اسی لیے زیادہ ہے کہ عبادات موقوفی ہیں اور ان میں کسی قسم کا اضافہ یا تبدیلی بدعت قرار دی گئی ہے۔ جب کہ معاملات اور دنیاوی امور میں جب تک ممانعت کی کوئی دلیل سامنے نہ آئے تب تلک وہ جائز اور مباح ہے۔ جمہور فقہا کے نزدیک اشیاء میں اصل اباحت ہے[3]۔

بیع مرابحہ سے مراد کسی کمیشن ایجنٹ کے ذریعے کوئی چیز خرید کر اس کو اس کی کمیشن دینا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق یہ اسلام میں ریاست میں جائز ہے۔ کیونکہ یہ ایک فرد کی محنت کا معاوضہ ہے اور اسی کو وکالت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کو بنیاد بنا کر مروجہ بینکاری کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ سود پر مبنی ہے[4]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی ہی تنظیم اسلامی کے ایک رکن حافظ عاطف وحید نے مروجہ اسلامی بینکار میں موجود متعین منافع کے نظام کو بھی اسلامی مزاج سے ہم آہنگ تسلیم نہیں کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> " مرابحہ اور مشارکہ متناقصہ جو عہد حاضر کے اسلامی بینکوں میں رائج اور مستعمل ہیں وہ اپنی حالیہ مروّج شکلوں میں شریعت کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور اسی لیے انہیں سود کا حقیقی متبادل قرار نہیں دیا جا سکتا[5]"۔

چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد مروجہ اسلامی بینکاری کے جواز کی تمام صورتوں کو حیلے پر ہی محمول کرتے ہیں۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت، ص:135

2۔ ڈاکٹر محمد عزیز، معاصر اسلامی بینکاری پر نظریہ اباحت کے اثرات، ایک جائزہ مشمولہ، اسلامی تہذیب و ثقافت، ج 1، شمارہ نمبر2، جولائی تا دسمبر، 2018ء، ص:68

3۔ ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین دمشقی ، رد المختار علی الدر المختار، (دار الفکر، بیروت، 2000ء)، ص:6 / 460

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت، ص:136

5۔ حافظ عاطف وحید، انسدادِ سود کا مقدمہ اور وفاقی شرعی عدالت کے 14 سوال، (مکتبہ خدام القرآن، لاہور، 2016ء)، ص:59

فصل سوم

اسلامی ریاست کا سیاسی ڈھانچہ

صدارتی نظامِ حکومت

کسی بھی ریاست کا انتظامی ڈھانچہ اس کے قیام اور اس کی بقا کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم سیاسی نظریات کا مطالعہ کرتے وقت ریاستی ڈھانچے کی نوعیت کو سب سے زیادہ اہم گردانا جاتا ہے۔ اس وقت دنیا میں کئی قسم کے سیاسی نظام مروج ہیں اور ان نظاموں کو ہر قوم نے اپنی اپنی ترجیحات کے حوالے سے تشکیل دے رکھا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی سیاسی فکر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک صدارتی نظام اسلامی سیاسی روح کے مطابق ہے۔ وہ مروجہ جمہوری اور پارلیمانی نظامِ ریاست کے قائل نہیں ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خلافتِ اسلامیہ کے سیاسی نظام میں ریاست کے جملہ اختیارات خلیفہ کے پاس تھے۔ اس کے ساتھ کام کرنے والی ایک شورائی مجلس ضرور تھی لیکن اس مجلس کے پاس اختیارات نہیں تھے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ عصرِ حاضر کا امریکی سیاسی نظام، جس میں صدر کے پاس کل اختیارات ہوتے ہیں، اسلام کے ریاستی نظام کے بہت قریب قریب ہے۔ اسلامی ریاست میں خلیفہ کو تاحیات منتخب کیا جاتا ہے جب کہ مروجہ جمہوری نظام میں صدر یا وزیر اعظم کو چار یا پانچ برس کے لیے حکومت کی زمامِ کار دی جاتی ہے۔ امریکہ میں صدارت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد صدر کو کانگریس کی مزید ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ:

> "ہم سب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ امریکہ اس دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک ہے۔ اس لحاظ سے اس کو دلیل کو سمجھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ پارلیمان کے نظام کے بجائے صدارتی نظام عمرانیات کے ارتقاء کی اعلیٰ ترین سطح پر کھڑا ہے[1]"۔

جدید ریاست میں انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے ذریعے ریاستوں کے خدو خال تشکیل دیے جاتے ہیں۔ صدارتی نظام کے مثبت پہلوؤں میں اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس کے تحت چلنے والی ریاست میں یہ تینوں شعبے الگ الگ اور آزاد ہوتے ہیں۔ صدر کے انتخاب کے بعد وہ مقننہ کی دست نگری سے آزاد ہو جاتا ہے۔ امریکی ریاست کو دیکھا جائے تو وہاں کئی مرتبہ ڈیموکریٹس کی کثرت کے باوجود ریپبلکن پارٹی سے کسی شخص کا انتخاب کر کے اس کو صدر بنا دیا جاتا ہے۔ پھر بھی وہ بغیر کسی رکاوٹ کے یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ ریاست کے انتظامی امور کے حوالے سے اپنی

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، ص 21

خدمات پیش کرتا رہتا ہے۔ کانگریس کا کام قانون سازی ہوتا ہے اور وہ بغیر کسی داخلی یا خارجی دباؤ کے اس کام میں مصروفِ عمل رہتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے بقول یہی آزادانہ طریقہ کار امریکہ کے ریاستی ڈھانچے میں کسی بھی گڑبڑ کو روک کر رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہی امریکہ میں عدلیہ کا ادارہ پوری آزادی کے ساتھ قانون اور آئین کے تحفظ کا فریضہ ادا کرتا ہے[1]۔ چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق ریاست کے حکمران یعنی صدر کا مقننہ میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔ مقننہ ایک الگ ادارہ ہے۔ دوسری جانب اسلامی نظامِ خلافت اس سے ایک الگ نظام ہے جس میں خلیفۃ المسلمین قانون سازی کے عمل کا بھی سربراہ ہوتا ہے۔ یہاں انتظامیہ اور مقننہ کی دوئی کا کوئی تصور نہیں ہے۔

مروجہ پارلیمانی نظام کی نفی

پارلیمانی نظام کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاں کئی تحفظات پائے جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس میں چونکہ ہر شخص اپنے اپنے مفاد کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے پارلیمانی نظام میں انتظامیہ اور مقننہ آپس میں گڈمڈ ہوتی رہتی ہے۔ اس اتھل پتھل کے دوران کسی بھی وقت کوئی سیاسی بھونچال آسکتا ہے یا کوئی بھی پارلیمانی نمائندہ اپنا ضمیر بیچ سکتا ہے۔ اس خوف سے نبرد آزما ہونے کے لیے پارلیمان کا سب سے طاقت ور نمائندہ "وزیر اعظم" اپنا زیادہ تر وقت ان کارکنان کی دیکھ بھال میں صرف کرتا رہتا ہے[2]۔

غالباً اس موقف کی بنیاد میں ڈاکٹر اسرار احمد کا ذاتی مشاہدہ شامل ہے۔ پاکستان کی سیاست میں یہ حقیقت موجود ہے کہ یہاں سیاسی نمائندے قوم کے مفاد کر نظر انداز کر کے ذاتی مفادات کے پیچھے دوڑ دھوپ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں نہ صرف پارلیمانی نظام متاثر ہوتا ہے بلکہ جمہوری سیاست کی حامل پارٹیوں کے نمائندے آئے روز مفادات کی خاطر جماعتیں بھی بدلتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی ملکی سیاست پر گہری نظر تھی اور دوسری جانب وہ اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں بھی غور وخوض کرنے کا مزاج رکھتے تھے۔ ان کے سامنے پاکستانی جمہوریت اور آمریت کے تمام رنگ واضح ہو چکے تھے اس لیے ڈاکٹر موصوف کے مطابق یہاں کی آمریت اور یہاں کا پارلیمانی نظام دونوں ہی حالات کے تقاضوں سے نبرآزما ہونے کے لیے مناسب نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے پاکستان اور بھارت، دونوں ممالک کے حالات وواقعات کو سامنے رکھتے ہوئے یہی تجویز کیا ہے کہ ان کے عوام کی فلاح وبہبود اور سیاسی استحکام کے لیے صدارتی نظام زیادہ موزوں اور مناسب ہے[3]۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، ص21

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص88، 89

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، پاکستان میں نظامِ خلافت کیوں اور کیسے (مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، 2005ء)، ص28

پاکستان میں فوجی آمریت کے کئی دور آ چکے ہیں اور ان میں صدارتی نظام کا نفاذ بھی دیکھا جا چکا ہے لیکن صدارتی نظام کی بنا پر اسلام یا پاکستان کے حوالے سے کوئی مثبت تبدیلی دیکھنے کو نہیں مل سکی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا یہ موقف اس حوالے سے بھی محل نظر ہے کہ صدارتی نظام کی مغربی صورت کو اگر برصغیر میں نافذ کر دیا جائے تو پھر اس کی اسلامی خلافت کے ساتھ کئی حوالوں سے تطبیق مشکل ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے مطابق صدر کو عدالتی باز پرسی سے استثناء حاصل ہوتا ہے جب کہ اسلام اسی بنیاد سے ہی مغربی صدارتی نظام کی نفی کر دیتا ہے کہ یہاں خلیفۃ المسلمین بھی عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔

صدر کے انتخاب کا طریقہ

اس نظام کے تحت حکمرانِ ریاست کے انتخاب کے لیے انتخابات کے طریقہ کو ہی اختیار کرنے کی تجویز دی گئی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ انتخابات کا یہ نظام اسلامی ریاست میں کچھ قیود و حدود کا پابند ہونا چاہیے۔ چونکہ ریاست کا ہر باشندہ ریاستی ڈھانچے کا ایک ذمہ دار رکن ہے اس لیے لازم ہے کہ انتخاب کے عمل میں زیادہ سے زیادہ شہریوں کو شامل کرتے ہوئے اس کو Broad Base بنانا چاہیے۔

ان کا موقف ہے کہ اسلامی ریاست میں متقی اور غیر متقی، دونوں کے ووٹ کی مساوی حیثیت ہو گی۔ ووٹ کے بعد جب ذمہ داریاں تفویض کی جائیں گی اور عہدے دیے جائیں گے تو اس وقت علم اور عمل کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان امتیاز کیا جائے گا۔ لہٰذا اسلامی حکمران کے انتخاب کے عمل میں ووٹ دینے کا حق تمام مسلمانوں کے پاس ہو گا۔ اس کا مقصد ڈاکٹر موصوف نے یہ بتایا ہے کہ:

> "یہ بات اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ روحِ عصر کا تقاضا بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو نظامِ حکومت میں اپنی شمولیت کا احساس ہو[1]"۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے ووٹ دینے والے افراد کو بھی چند امور کا پابند قرار دیا ہے اور وہی لوگ ان کے مطابق عامہ الناس میں سے ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں جن کی عمر چالیس برس ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی کہتے ہیں کہ عمر کے اس تعین میں کوئی حکمت نہیں ہے۔ اس میں یہ خدشہ بھی موجود ہے کہ ووٹر کی عمر اگر چالیس برس طے کر دی جائے تو ریاست کا ایک بہت بڑا طبقہ ووٹ دینے سے محروم ہو سکتا ہے۔ اس لیے ووٹر کی عمر کو مقید کرنے کے بجائے انتخابی امیدوار کی عمر مقرر کر کے چالیس برس کر دینی چاہیے[2]۔

1۔ خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص:96

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد اس ضمن میں مندرجہ ذیل قرانی آیت سے استدلال کرتے ہیں: حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَة (الاحقاف:15) (یہاں تک کہ جب وہ اپنی قوت کو پہنچا اور اس کی عمر چالیس سال ہو گئی۔)

یہ بھی کوئی قطعی قانون نہیں ہے بلکہ پارلیمان کے نمائندے اس ضمن میں مشاورت کے ساتھ قانون سازی کر سکتے ہیں۔ صرف عمر ہی نہیں بلکہ نمائندے کے لیے تعلیم کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اصول و ضوابط اس امیدوار پر ہی منطبق ہو سکتے ہیں جو ووٹ کے لیے اپنے آپ کو اہل اور قابل باور کرواتا ہے۔ جہاں تک ووٹ کی اہلیت کا مسئلہ ہے تو اس کے لیے ان شروط کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بظاہر کوئی شخص انتہائی متقی معلوم ہو رہا ہو لیکن حقیقت میں اس کے دل کی حالت کچھ اور ہو[1]۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیسے معلوم ہو گا کہ کوئی شخص سرکاری عہدے کا اہل ہے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے لکھا ہے کہ ان نمائندوں کو خود انتخابی کمیٹی کے سامنے ہو کر اپنا آپ کو صادق اور امین ثابت کرنا ہو گا۔ اس ضمن میں ان کو "تزکیۃ الشہود" کے عمل سے گزرتے ہوئے بتانا پڑے گا کہ ان کے پاس مال و دولت کی مقدار کیا ہے اور یہ مال و دولت انہوں نے کہاں سے کمایا ہے۔ اس عمل کے ذریعے کرپٹ لوگوں کے لیے سیاسی کیریئر بنانا انتہائی مشکل ہو جائے گا[2]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا یہ موقف آئین پاکستان کی ان شقوں کے عین مطابق ہے جن میں پارلیمنٹ کا رکن بننے کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کی تعیین کی گئی ہے:

- متعلقہ شخص اچھے کردار کا حامل ہو۔
- اس کے بارے میں یہ مشہور نہ ہو کہ وہ اسلام سے منحرف ہے۔
- اسلامی تعلیمات کے بارے میں اس کے پاس ضروری علم ہو۔
- وہ اسلامی فرائض کی پابندی کرنے والا ہو۔
- وہ گناہ کبیرہ سے گریز کرنے والا ہو[3]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے موقف کا تجزیہ

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق صدارتی نظام ہی اسلامی نظامِ خلافت کے قریب تر ہے۔ جب کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی سیاسی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی بھی نظام کے بارے میں قطعی اور دوٹوک

1۔ خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام، ص:97

2 ایضاً، ص:97

3 The Constitution of The Islamic Republic of Pakistan, Article 62, National Assembly of Pakistan, 2012A.D, p.34

موقف کے قائم کرنے کی گنجائش نہیں ہے بلکہ کسی بھی نظام کے بارے میں جملہ پہلوؤں پر غور کیا جا سکتا ہے۔ حالات وواقعات اور وقت کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی بھی حکومتی نظام کو اختیار اور نافذ کیا جا سکتا ہے۔

دوسری جانب اس حقیقت سے بھی مفر نہیں ہے کہ اسلامی سیاسی نظام میں اس جمہوریت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے جو اس وقت مغرب میں پنپ رہی ہے۔ اس سیاسی نظام میں ایک سے زیادہ سیاسی گروہوں یعنی حزب اختلاف اور حزب اقتدار کا ہونا ناگزیر ہے۔ ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا وجود امت کو گروہ بندیوں میں جکڑنے کا پیش خیمہ بن سکتا ہے جب کہ قرآن مجید نے اتحاد و اتفاق کی تعلیم دے رکھی ہے[1]۔ مغربی جمہوریت اور معاصر پارلیمانی نظام حکومت میں کثرت رائے کی بنیاد پر فیصلہ سازی کا عمل ہوتا ہے جب کہ اسلام نے اس قانون کو فیصلہ سازی کا معیار بنانے کی نفی کی ہے[2]۔

مفتی رشید احمد رحمہ اللہ نے اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی جمہوریت میں انسانوں کی تعداد کی بنا پر سیاسی نظام چلایا جاتا ہے۔ اس میں کھرے اور کھوٹے میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا ہے۔ عورت اور مرد، بچہ اور جوان، عالم اور عامی، دانا اور احمق وغیرہ سب ایک ہی ترازو میں نظر آتے ہیں۔ جس سیاست دان کے پلڑے میں ووٹوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اس کو قائد منتخب کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو ایک پچاس اہلِ علم ووٹ دیں اور دوسرے شخص کو ایک سو ان پڑھ، جاہل اجڈ اور گنوار لوگ ووٹ دیں تو اہلِ علم کے ووٹ حاصل کرنے والے شخص کو قیادت کا منصب نہیں دیا جاتا ہے۔ اس جمہوری نظام کی ایک قباحت یہ بھی ہے کہ یہاں محض جیتنا مقصد و مدعا ہوتا ہے اور اس کے لیے کوئی بھی حربہ استعمال کرنے کو برا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی پارٹیاں اپنے مخالفین کو نیچا دکھانے کے لیے پیسہ پانی کی مانند بہاتی ہیں۔ کامیاب ہونے کے لیے دھوکہ، جھوٹ، فریب اور دھاندلی و دھوکہ ایسے تمام ہتھکنڈے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ جو لوگ ووٹ حاصل کرنے اسمبلی میں پہنچتے ہیں ان کی بھی باقاعدہ بولی لگائی جاتی ہے اور مختلف قسم کے چکمے دے کر ان کو خریدا جاتا ہے۔ بکنے والے سیاسی گروہوں کے ایجنڈے کے مطابق ہر جائز و ناجائز کام کرتے ہیں اور نہ بکنے والوں کو مقتدر حلقے ہر سطح پر ناکام کرنے کے لیے طاقت و اقتدار کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ عوام میں اکثریت بے دین لوگوں کی ہے۔ اس لیے ان کی نظر میں دین دار لوگ قیادت اور سیادت کے قابل نہیں ٹھہرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پارلیمان بے دین اور فاسق و فاجر لوگوں سے بھری ہوئی ملتی ہے[3]۔

1۔ أوَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾ (اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ) (سورۃ آل عمران: 103)

2۔ أوَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ (اور اگر تو ان لوگوں میں سے اکثر کا کہنا مانے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے، وہ تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اٹکل دوڑاتے ہیں۔) (سورۃ الانعام: 116)

3 مفتی رشید احمد، احسن الفتاویٰ، جلد نمبر 6، صفحہ نمبر 24 تا 27، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی، 1422ھ

مولانا غلام رسول سعیدی نے اسی سیاسی قباحت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انتخاب کے دنوں میں پاکستانی ریاست کے ہر حلقے میں کثیر تعداد میں امیدوار سامنے آتے ہیں۔ یہ لوگ بے پناہ پیسہ خرچ کر کے لوگوں کو اپنے حق میں ووٹ دینے کے لیے قائل کرتے ہیں اور مخالف امید وار کی کردار کشی کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرتے ہیں۔ ان کی کنوینسنگ کے دوران تہمت، غیبت اور افترا کی تمام حدود کو پھلانگ دیا جاتا ہے۔ یہ تمام اقدامات اسلامی تعلیمات کے عین متصادم ہیں[1]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کا یہ موقف کہ ہر کسی کو ووٹ دینے کا حق ہونا چاہیے، اسلامی ریاستی کے انتظامی ڈھانچے کے اعتبار سے محل نظر ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ سیاسی منصب کا دعوے دار خود سامنے آکر اپنے آپ کو صادق اور امین ثابت کرنے کے دلائل دے، بھی تفتیشی اعتبار سے کمزور معلوم ہوتا ہے کیونکہ اپنی صداقت اور امانت کے ثبوت میں اس کے دعووں کو تحقیق و تفتیش بھی ایک ضروری عمل ہے اور اس کے لیے لا محالہ اسی انتخابی نظام میں کودنا پڑتا ہے جو کلیتاً مغربی دین ہے۔

مقننہ کی نوعیت

چونکہ اسلامی شریعت کا نظام منظم و مرتب حالت میں موجود ہے اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام سے متعلق تفصیلات ذکر کر دی گئی ہیں۔ اس لیے بادی النظر میں یہ تصور قائم ہو سکتا ہے کہ اگر اسلامی ریاست قائم ہو جائے تو شاید یہاں کسی قانون ساز اسمبلی کی ضرورت نہیں پڑے سکتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق یہ سوچ غلط ہے اور اس کو مسترد کرتے ہوئے انہوں نے مقننہ کے لیے اجتہادی مزاج کی اہمیت پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ سائنس اور صنعت کی دنیا میں ترقی آچکی ہے اور اس ترقی کے ساتھ نئے مسائل بھی پیدا ہو چکے ہیں۔ ان مسائل کے حل کے لیے قرآن اور سنت کی روشنی میں قانون سازی کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اگر معاشی حوالے سے دیکھا جائے تو محض زکوٰۃ کے بارے میں کئی مسائل سامنے آچکے ہیں۔ کارخانوں، ٹرکوں، بسوں، مشینوں وغیرہ پر زکوٰۃ کے حوالے سے کئی سوالات اٹھ رہے ہیں۔ حکومتیں بھی کاروبار کرتی ہیں۔ سرکاری اداروں کی آمدنی سے حاصل ہونے والے نفع پر زکوٰۃ اور اس کے مصارف بھی سوالات کی زد میں ہیں۔ اس نفع کو تعلیم، دفاع، صحت، ترقی و تعمیر پر خرچ کرنے کے حوالے سے تناسب کو یقینی بنانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ ان سب مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے قانون ساز ادارے کا متحرک ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنی تصانیف میں کئی مقامات پر اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ذیل میں چند اقتباسات دیے گئے ہیں:

1۔ غلام رسول سعیدی، شرح صحیح مسلم، (لاہور: فرید بک سٹال، 2013ء)، 5/765

"اب نبوت کے بعد اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ وحیٔ نبوت کا دروازہ بند ہے اور تا قیامِ قیامت بند رہے گا۔ تاریخِ انسانی کا بقیہ سارا دور اجتہاد کا ہے۔ اجتہاد میں مجتہد اپنی امکانی حد تک کوشش کرتا ہے کہ اس کی رائے قرآن و سنّت ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو لیکن وہ معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ اس اجتہاد میں خطاء بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر نیک نیتی کے ساتھ خطا ہے تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مجتہد مخطی کو بھی اجر و ثواب ملے گا[1]"۔

" پہلے خلافت کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ ان اصولوں کے بارے میں ہمیں کوئی compromise نہیں کرنا' بلکہ ان کو جوں کا توں بر قرار رکھنا ہے۔ البتہ جہاں حالات متقاضی ہوں وہاں ان اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کا راستہ اختیار کرنا ہو گا[2]"۔

اس لیے:

"یہ حقیقت ہمیں بہتر انداز میں سمجھ لینی چاہیے کہ اگر عصرِ حاضر میں اسلامی قانون کے نفاذ کو یقینی بنانا ہے تو ہمارے لیے اجتہاد کی راہ کو اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ اس دروازے کو ہم نے خود کئی صدیوں سے بند رکھا ہے[3]"۔

قانون سازی کے لیے اجتہاد کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس بات پر بھی تفصیلی گفتگو کی ہے کہ اجتہاد کا یہ اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہونا چاہیے۔ پارلیمنٹ کے حق اجتہاد اور اجتماعی اجتہاد کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں بھی اجتہاد پر سخت زور دیا ہے اور ان کا موقف بھی یہی ہے کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کے لیے اجتہاد کرنے والے لوگ پارلیمنٹ میں ہونے چاہییں۔ علماء اس پارلیمان کے قانون ساز شعبے کے مشیر بن سکتے ہیں[4]۔ ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ:

"علامہ اقبال کے تصور اجتہاد کو ان کے بیٹے نے فلسفیانہ الجھنوں میں ڈال کر ذہنی فساد برپا کر رکھا ہے۔ حالانکہ میرے (یعنی ڈاکٹر اسرار احمد کے) نزدیک اقبال کا تصور اجتہاد سو فیصد درست ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ قرآن و سنت کے دائرے میں رہ کر اجتہاد کرنا چاہیے اور حقیقت میں وہی اجتہاد قابل قبول ہے جو اس حد میں رہ کر کیا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ کو اس میں آزادی نہیں دی جا سکتی ہے کیونکہ اگر اس کو یہ اس ضمن میں مطلق اختیار دے دیا جائے تو پھر حکومت و اقتدار پارلیمان کے پاس چلا جائے گا جب کہ اسلامی سیاسی فکر کے مطابق اقتدار کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اگر دو لوگوں کے اجتہاد الگ الگ نتائج پیدا کریں تو پارلیمنٹ یہ فیصلہ کرے گی کہ کس کے اجتہاد کو اختیار کرنا ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ صرف انہی معاملات میں پارلیمنٹ کے

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، سانحہ کربلا، (لاہور: مکتبۃ خدام القرآن، 1983ء)، ص26

2۔ خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام، ص72

3۔ خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نفاذ، ص97، 98

4۔ علامہ اقبال، تجدید فکریات اسلام (مترجم: سید نذیر نیازی)، (لاہور: اقبال اکیڈمی، 2002ء)، ص177 تا212

پاس اجتہاد کرنے کا حق ہو گا جن کے بارے میں واضح شرعی تعلیمات موجود نہیں ہیں۔ پارلیمان کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال نہیں قرار دے سکتی ہے[1]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے موقف کا تجزیہ

پارلیمان کو قانون سازی کا اختیار دینے میں ڈاکٹر اسرار احمد تنہا نہیں ہیں بلکہ ان سے پہلے علامہ اقبال یہی موقف اپنے خطبات میں پیش کر چکے ہیں۔ عملی حوالے سے اس کا ایک مظہر امام ابو حنیفہ کی زندگی میں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ اس بارے میں لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے ایک ایسا کارنامہ سر انجام دیا تھا جو ان کے عہد میں کسی دوسرے عالم کے ہاں مذکور نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے چالیس قابل ترین شاگردوں کی ایک مجلس قانون ساز بنائی تھی۔ اس مجلس میں صرف اسلام علوم کے ماہرین ہی نہیں تھے بلکہ زندگی کے جملہ شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین بھی شامل تھے۔ یہ لوگ مسائل پر بحث کرتے اور ان کی بحث کئی کئی دنوں تک جاری و ساری رہتی تھی۔ بالآخر بحث کسی منطقی نتیجے پر ختم ہوتی تو امام ابو یوسف جو اس مجلس کے سیکریٹری تھے، اس کو لکھ لیا کرتے تھے[2]۔

یہی موقف علامہ اقبال نے پیش کیا تو علماء کی جانب سے اس پر ملے جلے تاثرات آئے۔ بعض علماء (ڈاکٹر ایوب صابر، ڈاکٹر اسرار احمد) نے اس کو قبول کر لیا جب کہ کئی اہل علم (عبد الماجد دریا آبادی، سید سلیمان ندوی وغیرہ) نے اس پر تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور اقبال اکیڈمی کے اشتراک سے "علامہ اقبال کا تصور اجتہاد" کے عنوان سے 2007ء میں ایک سیمینار منعقد ہوا جس کے مقالات کو جمع کر کے ڈاکٹر ایوب صابر اور محمد سہیل عمر نے اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے علامہ اقبال کے پارلیمانی اجتہاد کے تصور کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ:

> "میرے خیال میں اقبال جو کچھ فرماتے ہیں وہ بہت زیادہ غور کرنے کے قابل ہے۔، میں سمجھتا ہوں کہ اجماع کا institutionalize نہ ہونا بہت ہی صحت مند چیز تھی جو ہماری تاریخ میں ہوئی۔۔۔۔ اگر آپ اس کو institutionalize کر دیں گے تو پھر وہی ہو گا جو عباسی عہد میں ہوا تھا۔ خلق قرآن کے مسئلہ پر حکومت نے اپنے علما کو جمع کیا۔ ان سے ایک فتویٰ دلایا اور کہا کہ جو اس فتوے کو نہ مانے اس کو سزا دی جائے گی۔ اسی طرح آپ نے دیکھا کہ عباسی خلیفہ نے چاہا کہ امام مالک کی کتاب موطا کو ملک کا قانون بنایا جائے تو اس پر امام صاحب نے کہا کہ میں کون ہوتا ہوں کہ میری کتاب کو سارے مسلمانوں پر مسلط کر دیا جائے۔۔۔۔ اگر اب اس میں اجماع کو institutionalize کر دیں تو وہ اجتہاد کو روکنے والی چیز ثابت ہو گی[3]"۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام، ص93

2۔ ڈاکٹر حمید اللہ، خطبات بہاولپور، (اسلام آباد: ادارہ تحقیقات اسلامی، اشاعت سوم، 1990ء)، ص97، 102

3۔ ڈاکٹر ایوب صابر، محمد سہیل عمر، اقبال کا تصور اجتہاد، (لاہور: اقبال اکیڈمی، طبع دوم، 2011ء)، ص8، 9

اسی کانفرنس میں ڈاکٹر ایوب صابر نے علامہ اقبال کے پارلیمانی تصور اجتہاد کی تائید کی اور انہوں نے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری کے موقف کے جواب میں کہا کہ:

"اعتراض کیا جاتا ہے کہ ایک بے استعداد اور بد عنوان پارلیمان کو اجتہاد کا حق کیسے دیا جاسکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اقبال نے صرف یہی ایک بات نہیں کہی۔ فکر اقبال کو بحیثیت مجموعی بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ اقبال شخصیت کا اسلامی تصور اجاگر کرتے ہیں اور وہ شخصی تربیت پر زور دیتے ہیں۔ پھر تربیت یافتہ شخص کو قومی مقاصد کے لیے وقف کرنے کی بات کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ چنانچہ پارلیمان کو مسلمان بنانے کی ضرورت ہے۔ ایسی پارلیمان جس میں علما بھی موجود ہوں اور دوسرے علوم وفنون کے ماہرین بھی موجود ہوں، وہ اجتہاد کریں[1]"۔

اسی سیمینار میں ڈاکٹر ایوب صابر نے "اقبال کے تصور اجتہاد پر اعتراضات کا جائزہ" کے عنوان سے اپنا مقالہ پڑھا جو لائق مطالعہ ہے[2]۔

ڈاکٹر اسرار احمد بھی علامہ اقبال کے اسی موقف کے قائل ہیں اور اسلامی ریاست میں قانون سازی کا اختیار ان کے مطابق پارلیمان کی دستور ساز کمیٹی کے پاس ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے تاحال بحث جاری ہے اس لیے کسی موقف کو بھی قطعی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اگر صدارتی نظام کی وکالت کی جائے تو راجح کس کا موقف ہو گا؟ صدر کا یا پارلیمان کا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ:

" اس کے بعد اب یہ سوال پیدا ہو گا کہ اگر صاحبِ امر ایک بات کہے اور کچھ اہل علم یہ محسوس کریں کہ یہ ازروئے قرآن وحدیث غلط ہے تو اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ معاشرتی ارتقاء کا عمل آج جس مقام تک پہنچا ہے اس میں ریاست کے تین بنیادی اعضاء (basic organs) معین کیے گئے ہیں، یعنی مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ۔ اور یہ فرضِ منصبی عدلیہ یعنی اعلیٰ عدالتوں (higher judiciary) کے ذمے عائد ہو گا کہ وہ اس معاملے کو طے کریں۔ خطا کا امکان اگرچہ وہاں بھی ہے، لیکن بہرحال صاحب امر (خلیفہ) اور دستور ساز اسمبلی، جسے مجلس ملّی، مجلس شوریٰ، مجلس مقننہ، مجلس اجتہاد، کانگریس یا پارلیمنٹ، جو نام بھی دیا جائے، ان دونوں کے مابین بھی اگر نزاع پیدا ہو جائے تو اسے عدلیہ ہی کو طے کرنا ہو گا۔ اسی طرح قوم کا کوئی فرد اگر یہ سمجھتا ہے کہ مجلس ملی یا مجلس شوریٰ نے یہ جو فیصلہ کیا ہے یہ شریعت کے منافی ہے، یا وہ خلیفہ کے کسی فیصلے کے خلاف استغاثہ کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی عدلیہ ہی سے رجوع کرے گا[3]"۔

1۔ ایضاً، ص:6،7

2۔ اس مقالہ کا عنوان "اقبال کے تصور اجتہاد پر اعتراجات کا جائزہ" ہے۔ اس کے آغاز میں علامہ اقبال کے تصور اجتہاد کو نکات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اقبال کے تصورِ اجتہاد پر سامنے آنے والے اعتراضات بیان کر کے ان کے جوابات پیش کیے گئے ہیں۔ (اقبال کا تصورِ اجتہاد، ص:159 تا 180)

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، اطاعت کا قرآنی تصور، (مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، س ن)، ص:29،30

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق ریاستی ڈھانچے میں جہاں انتظامیہ اور مقننہ دو الگ الگ ادارے ہیں وہاں مقننہ کو جمہوری انداز میں عوامی حلقوں کے ساتھ مربوط کرنے کا تصور بھی ملتا ہے۔ یہ تصور علامہ اقبال سے مستعار لیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کی علمی و فکری منقبت اپنی جگہ پر مسلمہ ہے لیکن اقبال بہر حال قابلِ اختلاف ہیں اور ان کے پیش کردہ قانون سازی کے تصور سے ان کے عہد میں بھی علماء نے اختلاف کیا تھا۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد کو علماء کے اختیار میں ہی دینا چاہیے اور اس کو سرکاری تحویل میں رکھنے کی تائید کرنے کی صورت میں وہ منفی نتائج پیدا ہو سکتے ہیں جن کی طرف ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے اشارہ کیا ہے۔

باب چہارم

مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار کا تقابلی جائزہ

فصل اول: اقامت دین اور خلافت کے لئے کوششوں کے اثرات کا جائزہ

فصل دوم: تشکیلِ ریاست سے متعلق افکار میں مشترکات اور متفرقات

فصل سوم: موجودہ اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو

فصل اول

اقامت دین اور خلافت کے لئے کوششوں کے اثرات کا جائزہ

اقامت دین کے لیے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریری کوششیں

سید مودودی کے سیاسی افکار اور اسلامی نظام کی حمایت کا آغاز اس وقت ہوا جب قبل از تقسیم برصغیر 1936ء میں ہندوستان کے سات صوبوں میں کانگریس کو وزارتیں دی گئیں تو اس کے ارکان اور با اثر شخصیات نے متعصبانہ رویے کے ذریعے ہندوستان میں وحدتِ قومیت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے دلوں میں یہ خوف پیدا ہو گیا کہ اگر برصغیر کو انگریزوں سے آزادی مل گئی تو وہ ہندوؤں کی غلامی میں آ جائیں گے[1]۔ 1937ء میں مولانا مودودی نے مضامین کا ایک طویل سلسلہ بعنوان "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" شروع کیا جس میں ہندوستان میں قومیت کے تصور اور اس کے پس پردہ ہندوؤں کے عزائم کی قلعہ کھولی گئی۔ انہوں نے ایسے تمام مسلمان علماء پر سخت تنقید کی جو کانگریس کی تائید میں کھڑے تھے۔ سید مودودی نے واضح کیا کہ:

> "مسلمانوں اور کانگریس کی تحریک کے مابین کوئی قدر بھی مشترک نہیں ہے۔ مسلمانوں کی موت کانگریس کے لیے آب حیات ہے۔ کانگریس کی ہلاکت ہمارے لیے پیغام زندگی ہے۔ اصول و مقاصد میں ہمارے اور کانگریس کے مابین طریقہ کار کا کوئی اتحاد نہیں ہے بلکہ کھلا اختلاف ہے[2]۔"

سید مودودی نے قومیت کے مروجہ تصور کی نفی کرتے ہوئے ایک مبسوط مقالہ بعنوان "قومیت" لکھا۔ اس کے بعد "مرض اور اس کا علاج" کے عنوان سے ایک مضمون ترجمان القرآن میں شائع کیا جس میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ اس وقت دنیا میں کشمکش کا ماحول ہے اور یہاں جدوجہد مطلوب ہے۔ اس لیے دنیا کو بدلنے کے لیے اب محض باتیں کافی نہیں ہیں بلکہ اس کے لیے ایک انقلابی جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے نتیجے میں اسلام وہ سب کچھ بالفعل ہو جائے گا جو فی الحال محض بالقوۃ موجود ہے[3]۔

1۔ خورشید احمد، تحریکِ اسلامی، چراغِ راہ، تحریکِ اسلامی نمبر، (1963)، ص298

2۔ پروفیسر محمد سرور، مولانا مودودی کی تحریک اسلامی، (لاہور: دار الکتاب، کتاب مارکیٹ، اردو بازار، 2004ء)، ص11،10

3۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تنقیحات، (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، 1358ھ)، ص150

اقامت دین کے لیے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی سیاسی کوششیں

تحریر کے ساتھ ساتھ سید مودودی نے عملی طور پر اسلامی نظام کے لیے اس وقت فعال قدم اٹھایا جب 1941ء میں جماعت اسلامی وجود میں آئی۔ آغاز کے وقت ہی ان کے ساتھ بڑے بڑے لوگ شامل ہو گئے جن میں سید محمد شاہ، سید عبد العزیزی شرقی، مستری محمد صدیق، پروفیسر نعیم صدیقی، ملک غلام علی، مولانا صدر الدین اصلاحی اور میاں طفیل محمد وغیرہ شامل تھے[1]۔

1941ء میں جب تحریک پاکستان پورے عروج پر تھی، سید مودودی کے منشور کے ساتھ جماعت اسلامی کے رکن قمر الدین نے قائد اعظم کے ساتھ دہلی میں ایک تفصیلی ملاقات کی جس میں قائد اعظم نے کہا کہ جماعت اسلامی مسلمان کی اصلاح پر کام کر رہی ہے جب کہ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے ایک آزاد مملکت کے حصول کے لیے متحرک ہے۔ دونوں تحریکوں کا مقصد ایک ہے اور وہ ہے مسلمانوں کی بہتری[2]۔

اس کے بعد مولانا مودودی کی جدوجہد جاری رہی۔ 9 مئی 1947ء کو کل ہند اجتماع عام سے انہوں نے "اسلامی نظام اور مغربی لادینی جمہوریت" کے موضوع پر خطاب کیا جس کی افادیت کے پیش نظر اس کو شائع کیا گیا تھا[3]۔

5 جولائی 1947ء کو پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں جب صوبہ سرحد میں ریفرینڈم ہوا تو مولانا مودودی نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ میں پاکستان کے حق میں ووٹ دوں گا[4]۔

چنانچہ پاکستان کے قیام کے بعد انہوں نے عوام کی اصلاح و تربیت کا کام کرتے ہوئے ریڈیو کا استعمال کیا اور قائد اعظم کی وفات تک وہ اس سے منسلک رہے[5]۔

اسلامی قانون سازی میں سید مودودی کا کردار

سید مودودی نے 19 فروری 1948ء کو لاء کالج لاہور میں "پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی تدبیر" کے عنوان پر ایک پر مغز خطاب دیا۔ اگلے ہی ماہ میں سید مودودی نے صوبہ پنجاب اور صوبہ سرحد کے کئی شہروں کا دورہ کیا اور چار نکات پر مشتمل ایک مطالبہ عوام میں پھیلایا جس میں اسلام نظام کے نفاذ پر زور دیا گیا تھا۔ جماعت اسلامی نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی جس کا نعرہ "ہمارا مطالبہ: اسلامی نظام" اور "حاکمیت صرف خدا

1۔ آباد شاہ پوری، روداد جماعت اسلامی، حصہ اول، (لاہور: ادارہ معارف اسلامی منصورہ، 2013ء)، ص 20 تا 27

2۔ آباد شاہ پوری، روداد جماعت اسلامی، ص 107 تا 123

3۔ دیکھیے، ترجمان القرآن، ستمبر 1948ء

4۔ سید ابوالاعلی مودودی، رسائل و مسائل، حصہ اول، (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمٹیڈ، 1388ھ)، ص 363، 362

5۔ ریڈیو پاکستان پر یہ تقاریر "اسلام کا نظام حیات" کے نام سے نشر ہوتی رہی ہیں۔

کی" تھا۔ عوام نے جماعت اسلامی کے اس مطالبہ کی تائید کی اور بقول مولانا مودودی باطل قوتوں کے لیے جماعت اسلامی نے "شاہ ضرب" کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا[1]۔

اس کوشش کے نتیجے میں جماعت اسلامی کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا۔ سید مودودی پر الزام لگا کہ آپ جہاد کشمیر کے مخالف ہیں اور اس کو حرام قرار دیتے ہیں جب کہ حقیقت س کے برعکس تھی۔ مولانا مودودی نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ کھل کر بھارت کی مخالفت میں کشمیر کو عسکری طاقت کے بل بوتے پر حاصل کرے۔ جماعت اسلامی کے کئی ملازمین کو ان کی ملازمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ سرحد میں جماعت کے کارکنوں کو گرفتار کرنے واقعات بھی سامنے آئے لیکن سید مودودی نے ان آزمائشوں میں اپنے کارکنان کو صبر و تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کرنے کی تلقین کی[2]۔

4 اکتوبر 1948ء کو مولانا مودودی کے ساتھ میاں طفیل کو بھی گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گا۔ 22 اکتوبر 1948ء کو حکومت نے مولانا امین احسن اصلاحی کو گرفتار کر لیا۔ مولانا مودودی نے قید کا یہ زمانہ اپنے رفقاء کے ساتھ ملتان کی سنٹرل جیل میں گزارا۔ ان کی گرفتاری کے دوران مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ساتھ دیگر کئی علماء نے بھی نفاذ اسلام کے حق میں مہم چلائی جس کے بعد مسلم لیگ کی حکومت نے مجبور ہو کر 12 مارچ 1949ء کو قرار داد مقاصد منظور کی۔ 28 مئی 1950ء کو مولانا مودودی کو ان کے رفقا سمیت رہا کر دیا گیا۔ 1950ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قانون سے متعلق بنیادی اصولوں کے ضمن میں کچھ سفارشات پیش کیں جو لادینی اور غیر جمہوری تھیں۔ اس کے رد عمل میں سید مودودی نے 14 اکتوبر 1950ء کو لاہور میں ایک جلسہ سے خطاب کیا اور ان سفارشات کو مسترد کر دیا۔ اس کے رد عمل میں وزیر اعظم پاکستان خان لیاقت علی خان نے مسلمان علماء کو چیلنج کیا کہ وہ ایسی واضح اور ٹھوس سفارشات سامنے لائیں جو اسلامی دفعات کے نفاذ کا لائحہ عمل تشکیل دینے میں مدد و معاون ہوں۔ ان کا گمان تھا کہ مسلکی اختلافات کی بنا پر علما ایسی متفقہ سفارشات مرتب نہیں کر پائیں گے۔ لیکن یہ گمان غلط ثابت ہوا کیونکہ 21 جنوری 1951ء کو تمام مکاتب فکر کے 31 علماء نے کراچی میں جمع ہو کر سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت چار روزہ کانفرنس میں اسلامی دستور کے 22 نکات پر اتفاق کر لیا۔ ان علماء میں سید مودودی بھی شامل تھے۔ لیونارڈ ڈبائنڈر نے مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا مودودی کے بارے میں لکھا ہے کہ علماء سے ان 22 نکات منوانے میں ان کا کلیدی کردار تھا[3]۔

1۔ تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، نشان راہ، کراچی، 23 اپریل، 1948ء

2۔ ترجمان القرآن، ستمبر 1948ء

3. Religion and Politics on Pakistan, P. 120

جماعت اسلامی نے اسلام نظام کے نفاذ کے لیے سرکاری اور سیاسی سطح پر آغاز کرنے کے لیے 1951ء کے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان انتخابات میں جماعت کو پنجاب میں دولاکھ اٹھارہ ہزار ووٹ حاصل ہوئے۔ بعد میں مسلم لیگ کے ساتھ دوبارہ اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں ایک کش مکش شروع ہوئی تو لادین عناصر بھی جماعت کی مخالفت میں سامنے آ گئے۔ معروف وکیل اے کے بروہی نے چیلنج کیا کہ جو شخص یہ ثابت کر دے کہ قرآن مجید کی رو سے بنیادی دساتیر تشکیل دی جاسکتی ہیں، اس کو پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اس کے جواب میں مولانا مودودی نے "اسلامی دستور کی بنیادیں" لکھی اور اس میں ثابت کیا کہ جدید دنیا میں گیر تحریری دستور کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ بھی واضح کیا کہ قرآن مجید، نبی اکرم ﷺ کی سنن، صحابہ کرام کا تعامل اور امت کا اجماع اسلامی دستور کی بنیادیں ہیں[1]۔

سید مودودی نے ان کے کچھ عرصہ بعد ہی 24 نومبر 1952ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن کے سامنے "اسلامی دستور کی تدوین" کے موضوع پر ایک پر مغز خطاب کیا جس سے اے کے بروہی انتہائی متاثر ہوئے اور انہوں نے ہی 1954ء کی دستور ساز اسمبلی کے سامنے اسلامی دفعات کو مرتب انداز میں پیش کر کے پاس کروایا[2]۔

قادیانی مسئلہ

فروری 1953ء میں جب تحریک ختم نبوت عروج پر تھی، مولانا مودودی نے "قادیانی مسئلہ" لکھ کر حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔ چنانچہ مارچ میں مولانا مودودی کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسی دوران پاکستان میں مارشل لاء کا نفاذ ہو گیا اور پھر گورنر جنرل ملک غلام محمد کی جانب سے اس کی ملحدانہ و آمرانہ فطرت کا اظہار ہوا۔ اس نے فوجی عدالت کے توسط سے 11 مئی 1953ء کو مولانا مودودی کو سزائے موت کا حکم جاری کروایا۔ بعض مسلمان حکمرانوں کی بروقت مداخلت اور عوام کے دباؤ کی بنا پر سزائے موت ختم کر کے 21 سال قید با مشقت سنائی گئی۔ 1955ء کو مولانا مودودی کو رہا کر دیا گیا۔ 1956ء میں انہوں نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا اور وہاں چالیس روز علماء و مشائخ کے ساتھ ملاقاتوں میں گزارے۔ اس میں تین باتوں پر اتفاق کیا گیا:

1. پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ ہونا چاہیے۔
2. پاکستان میں جداگانہ طریقہ انتخاب کو رائج کیا جانا چاہیے۔

1۔ ہفت روزہ آئین، 19 ستمبر، 1964ء

2۔ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، "سید مودودی اور ان کے سیاسی افکار"، (مقالہ برائے پی-ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2000ء)، ص 23

3. پاکستان کے دستور کو اسلامی دفعات پر مشتمل ہونا چاہیے[1]۔

سید مودودی کی جمہوریت پسندی پر علماء کے تحفظات

چنانچہ اس کے بعد جن 23 مارچ 1956ء کو پاکستان کا پہلا دستور منظور ہوا تو یہ کسی حد تک جمہوری اور اسلامی تھا اور اس دستور کے ذریعے صوبائی خود مختاری کے مطالبہ کو بھی پورا کرنے کی کوشش سامنے آئی۔

1957ء کو ماچھی گوٹ میں جماعت اسلامی کے کارکنوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا جس میں جماعت کے بعض ارکان نے یہ دعویٰ کیا کہ جماعت اسلامی اب اپنے منشور سے ہٹ چکی ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر اسرار احمد نے تقریباً اڑھائی گھنٹے پر مشتمل ایک تقریر کی جس کو بعد میں 235 صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا[2]۔

وہاں موجود 946 ارکان میں سے 9 ارکان نے ڈاکٹر اسرار احمد کی تائید کی۔ بعد میں سید مودودی نے تین تین گھنٹے کی دو تقاریر میں یہ ثابت کیا کہ جماعت ابھی بھی اپنی پالیسی پر قائم ہے۔ اس اجتماع کے بعد جماعت اسلامی کے پندرہ افراد جماعت سے الگ ہو گئے[3]۔

غیر اسلامی قانون سازی کے خلاف سید مودودی کی مزاحمت

2 مارچ 1961ء کو اس وقت کی حکومت نے مسلمانوں کے قانون میں غیر اسلامی مداخلت کرتے ہوئے عائلی قوانین نافذ کرنے کی جرات کا ارتکاب کیا تو تمام مکاتب فکر کے 14 علماء، جن میں مولانا مودودی بھی شامل تھے، نے اس قانون کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد ایوب خان نے 1962ء میں نیا دستور بنا کر صدارتی نظام کو پاکستان میں نافذ کر دیا۔ اس نے صدر کو تمام اختیارات دلوا دینے کی کوشش کی تو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی واحد سیاست دان کی حیثیت سے سامنے آئے جنہوں نے اس دستور کو غیر جمہوری اور غیر اسلامی قرار دیا[4]۔

ایوب خان نے جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دیتے ہوئے 1964ء میں سید مودودی سمیت 44 اکابرین کو گرفتار کر کے جماعت اسلامی کے دفاتر، تعلیمی ادارے اور شفاخانے بند کروا دیے۔ گرفتار لوگوں کو نظر ثانی بورڈ، جس میں بیوروکریسی کے لوگ موجود تھے، کے سامنے پیش کیا گیا جہاں مولانا مودودی نے 17 صفحات پر مشتمل ایک تحریری بیان پیش کیا۔ اے کے بروہی کی کوششوں کے بعد 25 ستمبر 1964ء کو سپریم کورٹ نے جماعت اسلامی کو غیر قانونی قرار دینے کے حکومتی حکم کو پاکستان کے آئین سے متصادم اور کالعدم قرار دیتے ہوئے جماعت اسلامی کو

1۔ ہفت روزہ ایشیاء، 13 فروری، 1965ء

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک جماعت اسلامی، ص:18

3۔ سید مودودی اور ان کے سیاسی افکار، ص:27

4۔ ہفت روزہ ایشیاء، 14 تا 21 مارچ، 1961ء

بحال کر دیا[1]۔9 اکتوبر کو ہائی کورٹ نے اکابرین کی نظر بندی کے اقدام کو بھی غیر قانونی قرار دیا جس کے بعد سید مودودی اور ان کے 43 ساتھی قید سے رہا ہو گئے[2]۔

1967ء میں عید الفطر 13 جنوری، جمعہ کے روز بن رہی تھی لیکن صدر ایوب خان کو محسوس ہوا کہ یہ عید اس کی حکومت کے لیے بد شگونی ہے۔ چنانچہ اس نے رویت ہلال کمیٹی کو حکم دیا کہ عید کے ایک روز پہلے ہی عید کا اعلان کر دیا جائے۔ کمیٹی نے حکم کی تعمیل کی اور 11 جنوری کے شام کے وقت اگلے دن عید کا اعلان کر دیا۔ حالانکہ اس وقت مطلع صاف تھا اور کسی نے بھی چاند کے نکلنے کی گواہی نہیں دی تھی۔ سید مودودی اور دیگر علماء نے رویت ہلال کمیٹی کے اعلان کی مخالفت کی اور اگلے روز ملک میں تقریباً 98 فیصد لوگوں نے عید منانے کے بجائے روزہ رکھا۔ حکومت نے اس قدام کو سول نافرمانی سے تعبیر کیا[3] اور 29 جنوری کو مولانا مودودی گرفتار کر لیے گئے۔ نامور وکلا ڈاکٹر جاوید اقبال اور اے کے بروہی کے ساتھ ایم انور نے حکومت کے خلاف رٹ دائر کر دی تو حکومت نے خود ہی مولانا مودودی کو رہا کر دیا[4]۔

اشتراکیت پسندوں کے ساتھ سید مودودی کا تنازع

1968ء میں جب سید مودودی لندن سے گردے کا علاج کروا کر واپس آئے تو لاہور ائیر پورٹ پر انہوں نے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ ملک حضرت محمد ﷺ کی امت کا ہے اور یہاں کوئی بھی اس وقت تک اسلام کے سوا کوئی اور نظام نہیں چلا سکتا ہے جب تک ہماری گردنوں پر سر قائم ہیں۔ یہ ملک نہ تو ماؤزے تنگ کے ماننے والوں کا ہے اور نہ ہی اس سرزمین پر مارکس کے پیروکار بستے ہیں۔ اگر دین اللہ کے دفاع کے لیے ہمیں لڑنا پڑے گا تو ہم ایک کے بجائے دس محاذوں پر بھی برسر پیکار ہونے میں کسی چوک کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ 1970ء میں مولانا مودودی نے ڈھاکہ کا دورہ کیا لیکن وہاں علیحدگی پسندوں کی جانب سے جماعت اسلامی کے جلسہ پر حملہ کر کے جلسہ ہونے ہی نہ دیا۔ اس موقع پر تقریباً پانچ سو کارکن زخمی جب کہ دو افراد شہید ہوئے[5]۔

1۔ ہفت روزہ آئین، 30 ستمبر 1964ء

2۔ ایضاً، 17 اکتوبر، 1964ء

3۔ ایضاً 23 اپریل، 1966ء

4۔ سید مودودی اور ان کے سیاسی افکار، ص: 32، 31

5۔ ہفت روزہ ایشیاء، یکم فروری، 1970۔ روزنامہ ندائے ملت، لاہور، 20 جنوری 1970ء

مولانا مودودی نے اس وقت محسوس کر لیا کہ پاکستان کو توڑنے کی سازش اپنے عروج پر ہے اس لیے انہوں نے صدر یحیٰی خان کو ہوش کے ناخن لینے کی نصیحت کی[1]۔

اس وقت سوشلسٹ کافی فعال ہو چکے تھے۔ چنانچہ 31 مئی 1970ء کے دن کو مولانا مودودی کی اپیل کے بعد یومِ شوکتِ اسلام کے نام پر منایا گیا۔ ملک میں جلوس نکالے گئے اور اسلام کے نام پر مر مٹنے کا عہد کیا گیا تھا۔ لاہور میں نکلنے والے جلوس کی قیادت خود مولانا مودودی نے کی تھی[2]۔

1971ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ جب کہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی جیت گئی اور جماعت اسلامی کو محض چار نشستیں ملیں۔ ان نتائج پر اسلام پسند سخت مایوس ہوئے۔ مولانا مودودی نے اس موقع پر شورش کاشمیری کے نام ایک خط میں لکھا کہ حق و باطل کا معیار لوگوں کو رد و قبول نہیں ہے۔ اگر کثیر تعداد کے حامل افراد اندھیر نگری میں ٹھوکریں کھانا چاہتی ہے تو خوشی سے کھائے۔ ہمارا کام اندھیروں میں بہر حال چراغ جلانا ہے۔ یہ کام ہم آخری دم تک کرتے رہیں گے[3]۔

سید مودودی نے کارکنوں کو یہ نصیحت بھی کی کہ جمہوری کامیابی کے حصول کے لیے ہم کبھی بھی ناجائز راستہ اختیار نہیں کریں گے خواہ ہمیں اس صدی تک کامیابی نہ مل سکے[4]۔

اسلامی نظام کے لیے دعوتی سرگرمیاں

جامع مسجد منصورہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد مولانا مودودی کے زیادہ تر خطبات اسی مقام پر ہوتے تھے۔ 1976ء میں منصورہ میں وکیلوں کا ایک خصوصی کنونشن منعقد کیا گیا جس کی آخری نشست میں مولانا مودودی نے خطاب کرتے ہوئے وکیلوں سے کہا کہ کسی بھی ملک کا نظام عوام کے ذہنوں کی تبدیلی سے نہیں بدلتا ہے بلکہ ملک کا نظام اس کے چلانے والوں کے دماغوں کے بدلنے سے بہتر ہوتا ہے[5]۔

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے سیاسی تصورات ان کی عملی کاوشوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ قبل از تقسیمِ برصغیر متحدہ قومیت کی مخالفت کرنے سے لے کر آمریت کے خلاف ایک مضبوط دیوار بننے تک ان کے عملی کردار کی روشنی میں ہی سید مودودی کی سیاسی فکر کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی گہرائی جو جانا جا سکتا ہے۔

1۔ روزنامہ جنگ، کراچی، 20 جنوری 1970ء

2۔ روزنامہ مشرق، لاہور، یکم جون، 1970ء۔ روزنامہ کوہستان، لاہور، یکم جون، 1970ء

3۔ یہ خط ہفت روزہ چٹان، لاہور، 6 دسمبر، 1970ء میں شائع ہوا تھا۔

4۔ ہفت روزہ آئین، لاہور، 16 جنوری، 1971ء

5۔ ایضاً، 16 جون، 1976ء 94

اقامت دین کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد کی کوششیں

ڈاکٹر اسرار احمد کے دل میں شروع سے ہی اسلامی نظام کے نفاذ کی لگن اور تڑپ موجود تھی اس لیے انہوں نے زمانہ طالب علمی میں ہی اس کے لیے کام کرنے میں مصروفِ عمل مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ابھی وہ ناسمجھی کے دور میں تھے کہ برصغیر میں مسلم ہندو فسادات شروع ہو گئے۔ اس لیے ان کے اندر مسلم قوم پرستی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کم سنی میں ہی ان کو علامہ اقبال کے سانحہ ارتحال کی خبر ملی تو وہ خبر ان کے لیے ایک قومی نقصان کے غم و صدمے کی طرح تھی[1]۔

پاکستان کے قیام سے قبل 1945ء اور 1846ء کے انتخابات میں ڈاکٹر اسرار احمد نے ضلع حصار کی مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے سیکرٹری جنرل کے طور پر چلنے والی مہم میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس وقت وہ جماعت نہم میں تھے۔ فیڈریشن کے طلبہ کے ساتھ وہ عموماً ریلوے اسٹیشن پر نوائے وقت کے استقبال کے لیے جاتے تھے[2]۔ وہ اپنے قصبے کے علاوہ گرد و نواح کے قصبوں میں جا کر بھی انتخابی مہم میں اپنا کردار ادا کرتے تھے[3]۔ ان کی اسی لگن اور ان کے جوش کو مد نظر رکھتے ہوئے 1946ء میں قائد اعظم کا خطاب سننے کے لیے ایک طالب علم الواحد کے ساتھ ان کو لاہور بھیجا گیا۔ یہ خطاب اسلامیہ کالج لاہور میں قائد اعظم نے حبیبیہ ہال میں کیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد اس اعزاز پر فخر کیا کرتے تھے[4]۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب قیام پاکستان سے قبل لوگ نمازوں کے بعد گڑگڑا کر انگریز سے آزادی اور آزاد ملک کے قیام کی دعائیں مانگتے تھے، تب میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کیا جاتا تھا کہ آزاد وطن کے حصول کے بعد وہاں شریعت کا نفاذ ہو گا۔ اس وعدے کے پیش نظر ہی مسلمانوں نے مسلم لیگ کو ووٹ دیے تھے اسی لیے یہ وعدہ ایک فیصلے کی صورت اختیار کر گیا اور اسی فیصلے کی بنیاد پر نظریہ پاکستان وجود میں آیا[5]۔

جماعت اسلامی میں شمولیت

ان دنوں جماعت اسلامی بھی ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے بڑے بھائی اظہار احمد اس کے رکن تھے۔ ان کے ذریعے ڈاکٹر اسرار احمد کو جماعت اسلامی کی مطبوعات کے مطالعہ کا موقع ملا

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، ص12

2۔ ایضاً، ص15

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، استحکام پاکستان، ص42

4۔ ایضاً، ص43

5۔ قائد اعظم اور نظریہ پاکستان، ص30،31

جن کے زیر اثر ڈاکٹر اسرار احمد نے جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کر لی[1]۔ وہ ایک ہی وقت میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی دونوں کی تائید کر رہے تھے البتہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے مابین اختلافات کی وجہ سے اگر مسلم لیگ کا کوئی فرد سید مودودی پر تنقید کرتا تو ڈاکٹر اسرار احمد کی جانب سے مولانا مودودی کے دفاع کی بھرپور کوشش کی جاتی تھی[2]۔ ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں کہ مولانا مودودی کا لٹریچر پڑھ کر ان کو دو ایسی باتوں کو پتہ چلا جو ان کے علاوہ کسی دوسرے سکالر کی تحریروں میں مفقود تھیں۔(1) اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے اور یہ ایک ضابطہ حیات ہونے کے ناتے غلبہ چاہتا ہے۔(2) دینی فرائض میں صرف عبادات ہی شامل نہیں ہیں بلکہ زندگی کے جملہ معاملات بھی اس کے احاطہ میں ہیں[3]۔

پاکستان کے قیام کے بعد جب جماعت اسلامی نے وطن عزیز میں اسلام نظام کے نفاذ کا نعرہ بلند کیا تو ڈاکٹر اسرار احمد کو اس میں کشش محسوس ہوئی اور اسی لیے انہوں نے جماعت اسلامی لاہور کے ساتھ وابستگی اختیار کر لی۔ شروع میں آپ اسلامی جمیعت کے طلبہ کے رکن رہے اور اس کے بعد اس کی انتظامیہ میں شامل ہو گئے[4]۔ انہوں نے اس تحریک کے ساتھ اس قدر گہرا تعلق اختیار کر لیا تھا کہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے نقصان کی بھی پرواہ نہیں کی تھی[5]۔

جماعت میں شامل ہونے کے تقریباً ڈیڑھ برس بعد ان کو جماعت کی پالیسیوں سے اختلاف ہوا۔ یہ اختلاف ڈاکٹر اسرار احمد کے علاوہ دیگر کئی افراد کو بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے کچھ عرصہ بعد جماعت سے استعفیٰ دے دیا[6]۔ لیکن اس کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے نصب العین کو ترک نہیں کیا تھا۔ انھوں نے تن تنہا نفاذِ شریعت کے لیے کوشش شروع کر دی۔ اس تن تنہا کوشش کا دائرہ کار اصلاح اعمال اور شعوری بیداری کی کوشش کو محیط تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے نہ تو کبھی انتخابات میں حصہ لیا اور نہ کوئی سیاسی قدم اٹھایا۔ اس اعتبار سے ان کو جہاں نفاذ شریعت کا داعی قرار دیا جاتا ہے وہاں ان کو ایک مصلح کی صورت میں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ ساہیوال جا کر ڈاکٹر اسرار احمد نے درسِ قرآن کے کئی حلقے بنائے اور اس کے ساتھ کالج کے طلبہ کے لیے ایک ہاسٹل بنایا تا کہ وہاں مقیم طلبہ کی ذہن سازی کی جا سکے۔ اس دوران انہوں نے جماعت اسلامی سے الگ

1۔ حساب کم و بیش، ص20

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، ص26،15

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تنظیم اسلامی کی دعوت، (لاہور: انجمن خدام القرآن)، ص6

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزمِ تنظیم، ص19

5۔ ایضاً، ص:19

6۔ ڈاکٹر اسرار، تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب، ص112،91

ہونے والے بزرگوں کے ساتھ خط و کتابت جاری رکھی اور ان کو ایک نئی جماعت بنانے کی ترغیب دی تا کہ ان اصولوں کی بنیاد پر اسلام شریعت کے نفاذ کی راہ ہموار کی جاسکے جن اصولوں پر جماعت اسلامی نے خود اپنے کام کا آغاز کیا تھا۔ڈاکٹر اسرار احمد نے ساہیوال میں تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی تعلقات قائم کیے اور ان کے اجتماعات میں درس قرآن کا سلسلہ بھی شروع کیا لیکن بعد میں ان کو احساس ہوا کہ تبلیغی جماعت کا دائرہ عمل محض اصلاح اعمال تک ہے اور یہ نفاذ شریعت کے منہج پر نہیں چل رہی ہے تو انہوں نے تبلیغی جماعت سے بھی علیحدگی اختیار کر لی[1]۔

درسِ قرآن کے حلقے

ڈاکٹر صاحب نے کرشن نگر لاہور میں قرآن مجید کے درس کے لیے کئی حلقے قائم کیے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنا مطب قائم کر کے وہاں پریکٹس بھی شروع کر دی۔ان کی رہائش اور مطب دونوں ہی ساتھ ساتھ تھے۔درس قرآن کے حلقے انہوں نے لاہور کے مختلف علاقوں میں قائم کر رکھے تھے اور ہر روز شام کے وقت وہ کسی نہ کسی حلقے میں درس دیتے تھے۔یہ دور ان کی سخت ترین مصروفیت کا دور تھا۔وہ بتاتے ہیں کہ کرشن نظر میں جب وہ درس سے فارغ ہوتے تو مریض ان کے انتظار میں بیٹھے ہوتے تھے۔اس کے ساتھ انہوں نے جمعہ کا خطبہ اور اتوار کے روز صبح کا مرکزی درس قرآن بھی مختص کر رکھا تھا۔اس لیے ان کے پاس کوئی دن تو کجا، کسی دن کا ایک حصہ بھی آرام کے لیے دستیاب نہیں تھا۔درس قرآن،خطبہ جمعہ اور مطب میں کام کرنے کے علاوہ انہوں نے "میثاق" کا اجراء بھی کیا جس کے اداریے اور مضامین کی تیاری کے لیے بھی ان کو سخت مصروف رہنا پڑتا تھا۔اس وجہ سے وہ سخت بیمار رہنے لگے[2]۔

دار الاشاعت کا قیام

ڈاکٹر اسرار احمد اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ان کی دعوت و تبلیغ کے مشن میں شروع میں مالی تعاون دستیاب نہ ہو سکے گا اس لیے انہوں نے اپنی جیب سے اخراجات ادا کر کے ایک اشاعت خانہ قائم کیا اور اس کا نام دار الاشاعت رکھا۔لیکن اس دعوت میں وہ رومانیت نہیں تھی جس کو دیکھ کر لوگ دوڑتے چلے آتے۔وہ خود لکھتے ہیں کہ کرشن نگر میں مکان تیار کروانے کے بعد میں نے باقی ماندہ رقم کو بچا کر رکھنے کے بجائے دار الاشاعت میں کرچ کر دیا۔اس رقم سے جو مطبوعات منصہ شہود پر آئیں وہ چٹ پٹے ڈائجسٹوں یا ناولوں کی مانند قبول عام حاصل کرنے سے قاصر تھیں اس لیے مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ میرا یہ سرمایہ منجمد ہو گیا ہے۔نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ مولانا امین احسن

1۔ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیمِ اسلامی، ایک تعارف، (قرآن اکیڈمی، یٰسین آباد)، ص22

2۔حساب کم و بیش، ص30

اصلاحی کی تدبر قرآن جو دار الاشاعت سے ہی شائع ہو رہی تھی، کی دوسری جلد کو طبع کرنے کے لیے ڈاکٹر اسرار احمد کو ایک دوست سے رقم ادھار لینا پڑی[1]۔

انتخابات میں حصہ لینے کی دعوت

1970ء کے عام انتخابات کا وقت آیا تو جمیعت علماء اسلام کی جانب سے آپ کو صوبائی انتخابات میں حصہ لینے کے لیے قائل کیا گیا۔ اس وقت مفتی محمود احمد جمیعت علماء اسلام کے قائد تھے۔ مولانا خالد محمود اور مولانا اجمل خان ڈاکٹر اسرار احمد سے ملاقات کرنے ان کے مکان پر آئے اور ان کو دعوت دی کہ جمیعت علماء اسلام کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے انتخابات لڑیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد انتخابی سیاست کے ضمن میں فکری اختلاف کی بنا پر ہی تو جماعت اسلامی سے الگ ہوئے تھے۔ انھوں نے ان دونوں حضرات کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔ اس کے علاوہ ایک علاقائی رئیس نے بھی ان کو انتخابات میں شامل ہونے کی ترغیب دی تو ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ:

> "اگر یہ بات آگے بڑھی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے نفس کی گہرائیوں میں حب جاہ کی کوئی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے اور میں بھی انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنس کر ہمیشہ کے لیے اپنی منزل کھوٹی کر لوں[2]"۔

چنانچہ انہوں نے اس سے بچنے کے لیے عمرہ کا قصد کیا[3] حج کے دوران حرمین میں جو وقت گزرا اس میں ڈاکٹر اسرار احمد نے طے کیا کہ اب آئندہ زندگی اللہ تعالیٰ کے نظام کے نفاذ کے لیے کوشش و کاوش میں گزرے گی[4]۔

تنظیم اسلامی کا قیام

1975ء میں ڈاکٹر اسرار احمد نے تنظیم اسلام قائم کی اور اس کا مقصد اقامتِ دین اور غلبہ اسلام تھا[5]۔ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد ڈاکٹر اسرار احمد کے دروس اور کالموں میں لکھے جاتے رہے ہیں البتہ 1994ء میں قرآن آڈیٹوریم لاہور میں تنظیم اسلامی کے حلقہ لاہور کی جانب سے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ یہ خطاب بعد میں انجمن خدام القرآن لاہور نے "تنظیم اسلامی کی دعوت" کے

1۔ حساب کم و بیش، ص33

2۔ ایضاً، ص:39

3۔ ایضاً، ص:39،38

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزم تنظیم، ص42

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تنظیم اسلامی کی دعوت، ص:7

عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر اسرار احمد نے تنظیم اسلامی کے قیام کے اسباب اور مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ان میں اہم مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

1. قرآن مجید کی تعلیم کو عام کرنا[1]۔
2. اقامت دین[2]
3. شریعت پر عمل کرتے ہوئے دنیا کے سامنے اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ پیش کرنا[3]۔

اس مقصد کے حصول کے لیے جماعت اسلامی نے انتخابی سیاست کی راہ چنی تھی جس سے اختلاف کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے اس طریقے کو اسلام کے نفاذ کے لیے ناقص قرار دیا اور ان کا خیال ہے کہ انتخابی سیاست کے ذریعے پاکستان میں اسلام کا نفاذ ناممکن ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد اس کے بارے میں تفصیل لکھی ہے جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے:

پاکستان میں جمہوری سیاسی نظام جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہے اور عوام میں سے اسی فیصد لوگ جو ووٹ دیتے ہیں، وہ جاگیرداروں کے قبضے میں ہیں۔ اس لیے یہاں سیاست کے ایوانوں اور اسمبلیوں میں صرف سرمایہ داروں کا قبضہ نظر آتا ہے۔ ضیاء الحق کے دور میں بھی یہی جاگیر دار حکومت اور شوریٰ[4] میں شامل تھے۔ اس نظام میں عام انسان یا مصلح کے لیے اصلاحی کردار ادا کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے[5]۔

انتخابات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نظام کو چلایا جائے۔ نظام کبھی بھی انتخابات کے ذریعے بدل نہیں سکتا ہے۔ ایک کے بعد دوسری پارٹی اس لیے حکومت میں آتی ہے کہ وہ نظام کو اپنے طریقے سے چلا سکے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی تبدیلی آجائے تو وہ نظام کو چلانے کے انداز میں آسکتی ہے[6]۔

نفاذ شریعت کے لیے دعوت و تبلیغ بھی ایک طریقہ ہے لیکن ڈاکٹر اسرار احمد نے اس کے بارے میں کہا کہ دعوت سے محض سلیم الطبع لوگوں کو قائل کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکی دور میں سعید روحوں نے اسلام قبول کر

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تنظیم اسلامی کی دعوت، ص 21،20

2۔ ایضاً، ص 21

3۔ ایضاً، ص 25

4۔ 1981ء میں ڈاکٹر اسرار احمد کو بھی کو ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کی رکنیت ملی لیکن دو ماہ بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد نے لکھا ہے کہ مجھے ضیاء الحق نے مرکزی وزارت بھی پیش کی تھی لیکن میں نے معذرت کر لی اور کچھ عرصے بعد مجھے محسوس ہو گیا کہ ضیاء کا اسلام نافذ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اس لیے میں نے اس کی مجلس شوریٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ (تنظیم اسلامی کی دعوت، ص:9)

5۔ ایضاً، ص:35

6۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تنظیم اسلامی کی دعوت، ص36

لیا لیکن ان لوگوں نے اسلام کی مخالفت کی جن کے مفادات پر ضرب لگ رہی تھی۔اس لیے مدنی دور میں نبی اکرم ﷺ نے جہاد کی راہ اپنائی[1]۔

ان امور کی جانب توجہ دلا کر ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنا تصور انقلاب پیش کیا ہے جس کا ذکر سابقہ باب میں گزر چکا ہے۔

شریعت بل کی مخالفت

1987ء میں قاضی عبد اللطیف اور مولانا سمیع الحق نے پاکستان میں شریعت کے نفاذ کی غرض سے سینیٹ میں شریعت بل پیش کیا۔ پاکستان کی تمام دینی جماعتوں نے اس بل کو منظور کروانے کے لیے "متحدہ شریعت محاذ" کے نام سے اتحاد قائم کر لیا۔ حکومتِ پاکستان سے 27 رمضان المبارک تک یہ بل منظور کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور ساتھ یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر حکومت نے اس بل کو مسترد کر دیا تو سیاست میں موجود دینی جماعتوں کے اراکین سینٹ اور اسمبلی سے مستعفی ہو جائیں گے۔ اس کے بعد حکومت کے خلاف ایک احتجاجی تحریک چلائی جائے گی۔ اس محاذ کے ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد بھی منسلک ہو گئے اور انہوں نے بھی انتہائی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔

کراچی میں ہونے والے ایک اجلاس میں ڈاکٹر اسرار احمد نے مشورہ دیا کہ اس تحریک کو کسی ایک امیر کی اطاعت کے ساتھ چلانا چاہیے اور انہوں نے امارت کے لیے مولانا سمیع الحق کے والد مولانا عبد الحق کا نام تجویز کیا۔ شریعت بل کی تائید میں باہر نکلنے والے ان علماء نے ڈاکٹر اسرار احمد کی اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ 27 رمضان گزر گیا لیکن حکومت نے شریعت بل کو منظور نہ کیا۔ علما نے اسمبلی کی نشستوں سے استعفیٰ دینے والی دھمکی پر بھی عمل نہ کیا جس پر ڈاکٹر اسرار احمد کو سخت دکھ ہوا اور انہوں نے علماء کے اس کردار کو ایک بہت بڑا المیہ قرار دیا[2]۔

تحریک خلافت کا قیام

ڈاکٹر اسرار احمد اردنی اور فلسطینی عربوں کی تحریک حزب التحریر سے بھی متاثر تھے۔ اس تحریک کی جانب سے خلافت کے قیام کے بارے میں وافر لٹریچر منظر عام پر آ چکا تھا[3]۔ چنانچہ 1990 میں ان کے ایک دوست راؤ امید

1۔ ایضاً، ص:28

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیمِ اسلامی ایک تعارف، ص30

3۔ ڈاکٹر اسرر احمد، خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص9

علی خان نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ اپنے خطبات اور دعوت میں لفظ خلافت کا استعمال کیا کریں۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد آپ کی دعوت کی طرف متوجہ ہو گی[1]۔

1991ء میں عراق پر امریکہ نے حملہ کر دیا جس سے مسلمان دنیا میں بے چینی اور تشویش پیدا ہو گئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستان کے کئی شہروں میں اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے امریکہ کے منفی عزائم کو بے نقاب کیا اور اس کے ساتھ ساتھ گریٹر اسرائیل کے تصور سے لوگوں میں شعوری آگاہی پیدا کی۔ اس دوران ڈاکٹر اسرار احمد نے نظام خلافت کے قیام کی وجوہات اور اس کے قائم کرنے کے طریقہ کار پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس کے بعد انہوں نے محض خطبات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ 1991ء میں ہی تحریکِ خلافت کے قیام کا اعلان کر دیا[2]۔ انہوں نے واضح کیا کہ تحریکِ خلافت کے قیام کا مقصد منہاج النبوہ کی بنیاد پر خلافت اسلامیہ کا قیام ان کی اولین ترجیح ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ خلافت راشدہ کی یادیں مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک خوبصورت خواب کی طرح زندہ ہیں۔ اس لیے اس کے توسط سے لوگوں کے ذہنوں تک با آسانی رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس لیے "تحریک خلافت پاکستان" کے نام سے میں نے ایک ادارہ رجسٹر کرا کے اس کے تحت کام کا آغاز کیا[3]۔ اس تحریک کے مندرجہ ذیل مقاصد طے کیے گئے:

- عوام الناس میں اسلامی تعلیمات کے مطابق شعوری بیداری پیدا کرنا۔
- عوام کو خلافت کا مفہوم سمجھانا اور ان کو یہ باور کرانا کہ اس کی ضرورت کیوں ہے اور اس کو کس طرح قائم کرنا ہے۔
- پاکستان میں خلافت کے قیام کے لیے عوام کی تائید حاصل کرنا۔
- مروجہ سیاسی نظام میں موجود عوام کے استحصال کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرنا۔
- نظامِ خلافت کے قیام کے بعد آنے والی سماجی و اقتصادی خوش حالی سے متعلق لوگوں کو روشناس کرنا[4]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے یقین دلایا کہ اگر پاکستان میں خلافت کا نظام نافذ ہو گیا تو یہ اپنی تاثیر اور وسعت کے ذریعے پوری دنیا کو اپنے دائرہ میں لے سکے گا جس کے بعد سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں قائم ہونے والے

1۔ ایضاً، ص:10

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد اور تنظیمِ اسلامی ایک تعارف، ص30

3۔ ایضاً، ص9

4۔ دستور تحریک خلافت پاکستان ترمیم شدہ، تحریک خلافت پاکستان، لاہور، اگست 2002، ص3

معاشرے سے ہر کوئی مستفید ہو گا[1]۔ تحریک خلافت کے لیے ایک تحریری منشور اور قواعد وضوابط کا مجموعہ بھی تیار کیا گیا تھا[2]۔

تحریک کے زیر انتظام 2001ء میں ایوان اقبال لاہور میں ایک بین الاقوامی خلافت کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔اس کانفرنس میں متعدد ملکی و غیر ملکی علماء نے شرکت کی اور نظام خلافت کو تخلیق کائنات کا مقصد قرار دیا۔ تحریک خلافت کے زیر اہتمام ایک جریدہ "نداء" کے نام سے جاری کیا گیا۔بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے "ندائے خلافت" رکھا گیا۔بعد میں یہ تنظیم اسلامی کے ماتحت شائع ہونے لگا۔شروع میں تحریک خلافت کے کارکنوں نے اس کے منہج کے مطابق بڑھ چڑھ کر کام کیا۔بعد میں ان کے جوش وجذبے میں کمی واقع ہوتی گئی جس کے نتیجے میں خلافت کی تحریک کا کام بھی ان لوگوں کے کاندھوں پر آن پڑا جو تنظیم اسلامی کو چلا رہے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد نے 1997ء میں تحریک خلافت کا نظم ہر شہر سے ختم کر دیا۔ تحریک خلافت کو تنظیم اسلامی کے ماتحت کر دیا گیا اور یہ 2008ء تک جاری رہی[3]۔

حکومتِ وقت کو پند و نصیحت

1997ء میں ڈاکٹر اسرار احمد نے پاکستان میں قوانین اسلام کے نافذ کرنے کے لیے ایک مضبوط تحریک چلائی۔ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق پاکستانی قانون منافقت کا پلندہ ہے۔اس کو تبدیل کر کے شریعت کی روشنی میں تشکیلِ نو سے گزارنے کے لیے ڈاکٹر موصوف نے ایک ترمیمی خاکہ بنایا۔ اس کی اشاعت کی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے متحدہ مجلس عمل کی بااثر شخصیات کے ساتھ اس حوالے سے ملاقاتیں کیں۔ مسلم لیگ کو اس سے قبل جب انتخابات میں کامیابی ملی تو ڈاکٹر صاحب نے ان کے والد میاں محمد شریف کو ایک خط لکھا جس کے بعد وہ اپنے تینوں بیٹوں یعنی میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف اور میاں عباس شریف کو لے کر ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ دستور میں اسلامی تعلیمات کے مطابق ترامیم کریں گے۔اس کے بعد میاں محمد شریف بیمار ہو کر انگلینڈ علاج کے لیے چلے گئے۔جب وہ واپس آئے تو ڈاکٹر اسرار احمد نے اخباری میں ایک اشتہار دے کر ان کو ان کا وعدہ یاد دلایا۔ اس اشتہار کے بعد وہ اپنے بیٹوں کو دوبارہ ان کے پاس لے کر آئے اور ایک مرتبہ پھر دستوری ترمیم کا وعدہ کیا۔ سود کو ختم کرنا ایک مشکل کام تھا اس لیے شہباز شریف نے تین سال کی مہلت مانگی۔ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا کہ اس کے لیے تین سال کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو ایک سال میں ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ میاں محمد

1۔ ایضاً، ص2

2۔ اس کو "دستورِ تحریکِ خلافت پاکستان" کا نام دیا گیا اور یہ طبع ہو چکا ہے۔

3۔ یہ تفصیلات رافعۃ الجبین نے ڈاکٹر اسرار احمد کے رفقا کے انٹرویو کر کے حاصل کیں، دیکھیے: ڈاکٹر اسرار احمد شخصیت اور دینی خدمات، ص:156

شریف نے ان کے جواب میں کہا کہ ایک سال کا عرصہ بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کو چھ ماہ میں ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد حکومت نے وعدہ وفانہ کیا۔ جنرل حمید گل کے مطابق اگر یہ ترامیم پاکستانی دستور میں ہو جاتیں تو پاکستان میں Soft revolution آجاتا[1]۔

مذکورہ تمام تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے سید ابو الاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے لائحہ عمل میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مولانا مودودی کے مطابق نظریاتی اور سیاسی دونوں محاذوں پر آگے بڑھ کر کام کرنا لازم تھا جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق سیاسی راستہ اختیار کرنا خلافت علی منہاج النبوۃ کے ساتھ میل نہیں کھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سید مودودی کے کام میں تحریر و تقریر اور میدان کا عمل نظر اتا ہے جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے مشن میں تحریر و تقریر اور تذکیر و اصلاح نمایاں ہے۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے یہ واقعہ اپنی کئی کتب میں ذکر کیا ہے۔ دیکھیے: توبہ کی عظمت اور اس کی تاثیر، ص56، 67۔ انوارِ ہدایت (حصہ دوم)، ص:3

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، علامہ اقبال، قائداعظم اور نظریۂ پاکستان، (لاہور، خدام القرآن، 2007ء)، ص58، 57

فصل دوم

تشکیلِ ریاست سے متعلق افکار میں مشترکات اور متفرقات

ہمارے بحث کا بنیادی موضوع اسلامی ریاست سے متعلق سید مودودیؒ اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے افکار کا جائزہ لینا ہے اسلئے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ اسلامی ریاست سے متعلق دونوں مفکرین کے مشترک اور متفرق دونوں قسم کے آراء اور افکار کا تذکرہ کیا جائے۔ ذیل میں اسلامی ریاست کے اہم امور کے بارے میں دونوں مفکرین کے مشترکات و متفرقات کو ذکر کیا گیا ہے۔

سید مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے فکری روابط

ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودی کے مابین روابط موجود رہے ہیں البتہ ان میں اتار چڑھاؤ آتا رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد خود لکھتے ہیں کہ:

"میں جمعیت اور جماعت میں دس برس شامل رہا ہوں اور مولانا مودودیؒ سے بہت قریب رہا ہوں[1]"۔

انہوں نے سید مودودی کو اپنے فہم قرآن کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا جو تھوڑا بہت فہم اور فکر دیا ہے اس کے ذرائع (sources) میں آٹھ اشخاص بہت نمایاں ہیں۔ ان میں سے دو "اَبوین" ہیں، یعنی ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ابوالکلام آزادؒ[2]۔"

انہوں نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی منقبت میں لکھا ہے کہ:

" مولانا مودودی ایسا عظیم مصنف پورے عالم اسلام میں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا[3]"۔

اسی عقیدت کا نتیجہ تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد زمانہ طالب علمی میں جب جماعت اسلامی سے منسلک ہو گئے تب اگر کوئی مولانا مودودی پر تنقید کرتا تو ڈاکٹر موصوف اس کو جواب دینے کی پوری کوشش کرتے تھے[4]۔

اس نسبت اور تعلق کی وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے سیاسی افکار میں موافقت پائی جاتی ہے اور بعض مقامات پر ڈاکٹر موصوف نے انتہائی احتیاط کے ساتھ مولانا مودودی کے ساتھ اختلاف بھی کیا ہے۔ اسی اختلاف کی وجہ سے ڈاکٹر اسرار احمد نے بعد میں سید مودودی سے علیحدگی اختیار کر کے تنظیم اسلامی قائم کر

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، انفرادی نجات اور اجتماعی فلاح کیلئے قرآن کا لائحہ عمل، (لاہور: خدام القرآن، 2001ء)، ص53

2۔ ڈاکٹر اسرار، علامہ اقبال، قائداعظم اور نظریۂ پاکستان، ص18

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، سابقہ اور موجودہ مُسلمان اُمتوں کا ماضی، حال اور مستقبل اور مُسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمّہ داری، (لاہور: خدام القرآن، 2001ء)، ص132

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، عزمِ تنظیم، ص13

لی تھی۔ علیحد گی کے بعد بھی وہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کے لیے کام کرتے رہے۔ سید مودودی کا بھی یہی خیال تھا البتہ دونوں کے مناہج میں اختلاف تھا۔

سید مودودی نے جب ڈاکٹر اسرار احمد کو اپنی جماعت سے الگ ہو کر نئی جماعت بناتے ہوئے دیکھا تو اس پر سیخ پا نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "

"اس شخص کے بارے میں مجھے یہ اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی رہے گا دین کا کام کرتا رہے گا[1]"۔

مولانا مودودی نے عصرِ حاضر میں اسلامی ریاست کے خدوخال سب سے زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر خورشید احمد نے اسلامی ساسیات کے بارے میں سید مودودی کی تحریرات کو سیاسی علم کلام کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ سید مودودی کا سب سے اہم علمی کام یہ ہے کہ انہوں نے دین و دنیا کی تفریق کے تصور کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ انھوں نے پوری شرح بسط کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ عصر حاضر میں ریاست کے محکموں کو اسلام کے انتظامی اصولوں کے تحت کس طرح متحرک کیا جاسکتا ہے[2]۔

ڈاکٹر اسرار احمد بھی سید مودودی کے اسی تصور دین کو اپناتے ہیں اور ان کے مطابق بھی اسلامی ریاست کا مکمل ضابطہ حیات دین کے تصور کے احاطہ میں آتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"ایک پورا انظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع، مقنن "law giver" اور حاکم مطلق (sovereign) مان کر اس کی جزا کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ قانون اور ضابطے کے مطابق اس ہستی یا ادارے کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے[3]۔

اسلامی ریاست کی تعریف

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا موقف ہے کہ جو ریاست نبوی منہاج اور الٰہی حاکمیت کے نظام کو اس کے ضمنی مشمولات کے ساتھ نافذ کرنے کی خواہاں ہو[4]۔ اس نظریے کی بنیاد سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس ریاست کا اقتدار اعلیٰ اصل میں اللہ تعالیٰ کی نیابت و امانت ہے[5]۔ اس ریاست کا حکمران بھی قانون سازی کا مختار

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام اور پاکستان، ص5

2 ۔ خورشید احمد، مقدمہ، اسلامی ریاست، ص31

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، مطالبات دین، (تنظیم اسلامی پاکستان، 1978)، ص77،76

4۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص517

5۔ مودودی، سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، (بریلی: بریلی الیکٹرک پریس)، ص23،20

نہیں ہے بلکہ قانون وہی ہے جو قرآن و سنت کے ذریعے ہمیں دیا گیا ہے[1]۔ مسلمان حکمران اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کی رو سے دیے گئے اختیارات کو استعمال کرنے کا "ذمہ دار" ہے[2] اگر وہ اپنے اختیارات کی حدود بندی کرنے کی جانب گامزن ہو گا تو ان حدود کو قرآن مجید اور سنت نبوی ﷺ کی روشنی میں طے کیا جائے گا[3]۔

حکمران کو اسلامی ریاست میں مکمل اطاعت اور فرمان برداری کروانے کا حق حاصل ہے۔ یہ حق اس کے پاس اس وقت تک ہے جب تک وہ معروف کاموں میں عوام کو مصروف عمل رکھتا ہے[4]۔ اگر اس کی جانب سے عوام کو غیر معروف یا معصیت الٰہی پر مجبور کیا جائے تو اس کے پاس حقِ اطاعت باقی نہیں رہ سکے گا۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس تصور سے مکمل اتفاق کیا ہے کہ اسلامی ریاست ایک ایسی ریاست ہے اسلامی ریاست میں زندگی ایک ایک مکمل نظام ہوتا ہے جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کو قادر مطلق اور حاکم مطلق ماننے پر ہوتی ہے[5]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے امیر کو بھی اسلامی روایات کا پابند قرار دیتے ہوئے سید مودودی کے موقف میں میں ایک اور بات کا اضافہ کیا ہے اور ان کے مطابق اگر مسلمانوں پر غیر مسلم حکمران مسلط ہو جائے تو مسلمانوں پر اس کی اطاعت کرنا ضروری نہیں ہے کیونکہ وہ "اولی الامر" میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ مسلمانوں پر صرف مسلمان حکمران کے معروف کاموں میں اطاعت لازم ہے[6]۔

انہوں نے لکھا ہے کہ بعض اوقات کسی ظالم اور جابر حکمران کی اطاعت بھی کی جاتی ہے لیکن اس اطاعت کی بنیاد میں جبر اور بے بسی کار فرما ہوتی ہے[7]۔ اس کی مثال میں مصر میں بنی اسرائیل کی محکومی کو پیش کیا ہے جن پر فرعون اور اس کی قوم حکمران بن چکی تھی اور ان کو زبردستی اپنی اطاعت اور فرماں برداری پر مجبور کیا جارہا تھا لیکن جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو موقع ملا انہوں نے اپنی قوم کو ساتھ لے کر ہجرت کر لی[8]۔

1۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص36

2۔ مودودی، خلافت وملوکیت، ص32

3۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص37

4۔ مودودی، خلافت وملوکیت، ص:70

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، مطالبات دین، ص:77،76

6۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: اطاعت کا قرآنی تصور، ص:27،26،25

7۔ ڈاکٹر اسرار احمد، نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں، (لاہور: مکتبہ خدام القرآن، 1399ھ)، ص13

8۔ ڈاکٹر اسرار احمد، مطالبات دین، ص18

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر کوئی غیر مسلم اور جابر حکمران مسلط ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت کرنے میں مسلمانوں کے لیے ہی خطرات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو ہجرت کر کے دار السلام کا رخ کر لینا چاہیے۔

اسلامی ریاست اور جمہوریت

سید مودودی نے ملت اسلامیہ کو ریاستی نیابت و خلافت کی کفیل قرار دیا ہے جس میں جمہوری اقدار چھلکتی ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خلافت کا وعدہ ایک فرد کے ساتھ نہیں بلکہ تمام اہل ایمان کے ساتھ کیا ہے۔ اس لیے اہل ایمان مجموعی طور پر اس کے حامل ہیں۔ اس اعتبار سے یہ خلافت کسی شخص، خاندان، نسل یا طبقہ کے لیے خاص نہیں ہے[1]۔

وہ جماعت جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور شریعت کے قوانین کی بالادستی کو تسلیم کر کے اس کے نفاذ کی قائل ہو وہ جماعت یا طبقہ صحیح نوعیت کی حکومت و خلافت کا حامل ہونا چاہیے۔ اسی بنیاد پر اسلامی ریاست مذہبی پیشوائیت، طبقاتی حکومت اور ملوکیت سے ممتاز ٹھہرتی ہے[2]۔ اسی کو سید مودودی نے اسلامی جمہوریت قرار دیا ہے[3]۔

یہاں ایک طرف عوام کو ایک محدود حاکمیت عطا کی گئی ہے تو دوسری طرف شرعی قوانین کا نفاذ لازمی قرار دیا گیا ہے اس لیے اس کے لیے سید مودودی نے اس نظام کو "الٰہی جمہوریت" کا نام دیا ہے[4]۔

اس بات سے ڈاکٹر اسرار احمد بھی متفق ہیں کہ مولانا مودودی نے شروع میں حکومت الٰہیہ کا نعرہ بلند کیا تھا اور یہی ان کا نصب العین تھا[5]۔

مولانا مودودی اس کے ساتھ ساتھ وہ مروجہ جمہوریت کی نفی بھی کرتے ہیں اور ان کا موقف ہے کہ اس میں پہلی خامی یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی سیاسی پارٹیوں کے وجود پر رکھی گئی ہے۔ اس کی وجہ سے عصبیتیں سر اٹھاتی ہیں اور کوئی جاہ پسند ٹولہ اقتدار پر قابض ہو جانے کے بعد عوام کے پیسے کو استعمال کرتے ہوئے اپنے حمایتی پیدا کر لیتا ہے۔ عوام اس پر جتنا بھی شور مچائیں، مقتدر ٹولہ اپنے حمایتیوں کی مدد سے اپنی من مرضی دوسروں پر لاگو کرتا رہتا ہے[6]۔

1۔ مودودی، خلافت و ملوکیت، ص 35، 36

2۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص 37

3۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص 37 تا 39

4۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص 24، 25

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، جہاد فی سبیل اللہ، (لاہور: مکتبہ خدام القرآن، 1999ء)، ص 51

6۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص 47

دوسری جانب اسلام کسی بھی انسان کو محض اپنے گروہ کا ساتھ دینے کی اجازت نہیں دیتا ہے بلکہ اس ضمن میں اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ حق کا ساتھ دیا جائے اور اپنا گروہ اگر حق کی مخالفت کر رہا ہو تو اس کے ساتھ اختلاف کیا جانا چاہیے[1]۔

مولانا مودودی نے یہ واضح نہیں کیا کہ اس نظام میں حق کا ساتھ دینے کے لیے محض ایک سیاسی جتھابندی کر کے انتخابات کا حصہ بننا ہی واحد حل ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور لائحہ عمل بھی تشکیل دیا جا سکتا ہے۔

دوسری جانب ڈاکٹر اسرار احمد مولانا مودودی کے تصورِ جمہوریت سے ہی اختلاف کرتے ہیں۔ انھوں نے جماعت اسلامی کے تصور جمہوریت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا مودودی کا یہ گمان کہ ہم جمہوریت کے ذریعے اقتدار میں آ کر حالات کا پانسہ پلٹ دیں گے، غلطی پر مبنی تھا[2]۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

> "یہ جو مغرب کا تصورِ جمہوریت ہے کہ ووٹوں کی گنتی سے معاملات طے کیے جائیں اس سے بچو! اسلامی نظم جماعت میں باہمی مشورے کے بعد فیصلے کا اختیار صاحب امر کو حاصل ہوتا ہے[3]"۔

ڈاکٹر اسرار احمد جمہوریت کی تردید میں سختی سے کام لیتے ہیں اور اسی شدت و سختی کی بنا پر انہوں نے جمہوریت کو شرک کی بدترین شکلوں میں سے ایک قرار دیا ہے[4]۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> " انسانی حاکمیت (human sovereignty) 'ہر حال میں شرک ہے' چاہے وہ بادشاہت اور ملوکیت (monarchy) ہو 'چاہے جمہوریت democracy)) ہو اور چاہے مذہبی حکومت (theocracy) ہو۔ اگر کوئی فردِ واحد بیٹھا ہے کہ حاکم میں ہوں 'میرے ہاتھ میں قانون سازی کا اختیار ہے 'میری زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون ہے 'تو یہ بدترین شرک ہے[5]"۔
>
> "بادشاہت و ملوکیت 'مذہبی حاکمیت اور جمہوریت تینوں ہی شرک کی شکلیں ہیں[6]"۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص596

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریق انقلاب، ص47

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، اطاعت کا قرآنی تصور، (لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن)، ص43

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، مطالبات دین، ص92

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، حقیقت و اقسام شرک، (لاہور: مکتبہ خدام القرآن)، ص95

6۔ ایضاً، ص:96

"انسانوں کے لیے حاکمیت نہیں' خلافت ہے۔ انسانوں کی حاکمیت خواہ شخصی ہو یا اجتماعی' قرآن کی رو سے شرک ہے۔ جمہوریت کا اصول popular sovereignty ہے۔ یہ بھی اتنا ہی بڑا کفر و شرک ہے جتنا کسی انسان کی انفرادی حاکمیت۔ فرعونیت' نمرودیت اور عوامی حاکمیت میں نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں[1]"

البتہ ڈاکٹر اسرار احمد نے ایسا استثنائی صورت بھی نکالی ہے جس کے مطابق جمہوریت شرک نہیں کہلا سکتی ہے اور اسی صورت میں ڈاکٹر موصوف اور مولانا مودودی کے موقف کے مابین موافقت محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی جمہوریت یہ پہلے کر کہ تشریع کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور اس کی طے کردہ حدود و قیود میں رہ کر پارلیمان کام کرے گی تو اس صورت میں جمہوریت شرک نہیں ہو گی۔ لیکن عمومی جمہوریت، مطلق ملوکیت یا پھر مطلق تھیوکریسی شرک ہی کہلائے گی[2]۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک جمہوریت کی بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں پارٹی بازی کا عنصر جزوِلازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جمہوریت کا پیروکار اپنی پارٹی کے برے سے برے کاموں میں بھی اس کا حمایتی ہوتا ہے اور مخالف پارٹی کے اچھے سے اچھے کام کا بھی مخالف ہوتا ہے[3]۔

جمہوریت کے بارے میں بنیادی فکر کے اختلاف کی بنا پر ہی ڈاکٹر اسرار احمد نے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تحریک سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی علیحدہ جماعت قائم کی تھی۔

اسلامی ریاست اور حکمران

سید مودودی کا موقف ہے کہ آمریت کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے۔ تمام مسلمان خلفا اپنی مرضی سے اپنی خلافت ایک فرد کو سونپتے ہیں تا کہ ریاست کی انتظامی اغراض کو پورا کیا جا سکے۔ وہ فرد اللہ تعالیٰ اور ریاستی باشندوں یعنی خلفاء کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ اگر وہ شخص مطلق آمر بن جائے گا تو اس کی حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ غاصب کی ہو گی جو جمہوری خلافت کی کلی نفی ہے[4]۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام، ص74

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، حقیقت و اقسامِ شرک، ص97

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، تعارف تنظیم اسلامی، ص53

4۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص23، 24

انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اسلامی ریاست میں امارت و حکومت اس کے باشندوں کی اکثریت کی رائے کے ذریعے ہی عملی طور پر ظہور میں آتی ہے[1]۔

عام لوگ جس شخص کی حکومت کے لیے رضامندی ظاہر کریں گے وہی حکمران بنے گا۔اس منصب پر کسی خاندان یا گروہ کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی ہے۔امیر کے انتخاب کا عمل بھی مسلمانوں کی آزادانہ رضامندی کے ذریعے ہونا چاہیے[2]۔

مولانا مودودی کا موقف ہے کہ اسلامی ریاست چونکہ ایک نظریاتی ریاست ہے اس لیے اس کی حکمرانی کی ذمہ داری صرف اس شخص یا گروہ کو دی جا سکتی ہے جو اسلامی نظریات حیات پر یقین رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ قولی و عملی طور پر متفق ہوں[3]۔

اس شخص کے انتخاب کا اسلام نے کوئی مخصوص طریقہ نہیں بتایا ہے بلکہ حالات و واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے عوام کی رائے جاننے کے لیے کوئی بھی اسلوب اختیار کیا جا سکتا ہے[4]۔

ووٹ دینے یعنی رائے کا اظہار کرنے کے لیے ووٹر کا مسلمان، عاقل اور بالغ ہونا کافی ہے کیونکہ ہر ریاستی مسلمان باشندہ خلافت کے بار کا حامل ہے اور تمام مسلمان دیگر معاملات کی طرح اس حوالے سے بھی مساوی ہیں[5]۔

سید مودودی کے مطابق حکمران کے انتخاب کے لیے اس میں چند شرائط کا پورا ہونا انتہائی اہم ہے۔ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ جس شخص کو حکمرانی کے لیے منتخب کیا جائے اس کے لیے مسلم ریاست کی اکثریت کی نظر میں بااعتماد ہونا لازم ہے۔اس کے بعد لازم ہے کہ وہ فرد عادل، متقی، مسلمان، امین، نیکوکار، خدا ترس، ظلم و فسق و فجور سے دور، باعلم، معاملہ فہم اور دانا ہو۔اس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے جسمانی و ذہنی طور پر صحت مند ہونا بھی ضروری ہے[6]۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص361

2۔ ایضاً، ص362

3۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص33

4۔ ایضاً، ص:41

5۔ مودودی، خلافت وملوکیت، ص37 تا41

6۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص351

ڈاکٹر اسرار احمد یہاں سید مودودی سے اختلاف کرتے ہوئے سرے سے پارلیمانی نظام کو ہی غلط سمجھتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ پارلیمانی نظام میں ایک محدود مدت کے لیے حکمران کا انتخاب ہوتا ہے جب کہ اسلامی سیاسی نظام میں حکمران کو تاحیات منتخب کیا جاتا ہے[1]۔

ان کا خیال ہے کہ اسلام نے نہ تو پارلیمانی خلافت کو لازم قرار دیا ہے اور نہ ہی صدارتی خلافت کو، اسلامی کی نگاہ میں دونوں ہی مباح ہو سکتے ہیں البتہ اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج کے سیاسی تناظر میں اگر خلافت راشدہ کے نظام کی تعبیر کی جائے تو صدارتی نظام اس کے زیادہ قریب ہو گا۔ڈاکٹر اسرار احمد نے اس کو "وفاقی نہیں بلکہ وحدانی طرزِ حکومت" قرار دیا ہے۔ان کے مطابق یہ عوام پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح کے نظام کو ملکی و قومی تقاضوں سے ہم ہنگ کر کے اپناتے ہیں[2]۔

پارلیمانی نظام میں مقننہ اور عدلیہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے صدارتی نظام کو شریعت کے مزاج کے قریب قرار دیا ہے[3]۔

دوسری جانب وہ کچھ حدود و قیود کے ساتھ الیکشن کے نظام کا جواز بھی پیش کرتے ہیں۔ان کا موقف ہے کہ مسلمان خلیفہ کا انتخاب پارلیمنٹ یا کانگریس کا محتاج نہیں ہو گا بلکہ اس کے لیے براہ راست عوام کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔اس کا فائدہ عین اسلامی روح کے مطابق ہو گا کہ علاقائی وڈیروں کا کردار غیر موثر ہو جائے گا۔لوگ اس کو حکمران منتخب کریں گے جو ان کی نظروں میں معتمد ہو گا۔لوگ اپنی رائے دہی کا حق ااستعمال کریں گے[4]۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ صدارتی نظام کے تحت منتخب حکمران کو دنیا کے مقبول و معروف نظاموں کی طرح ایک مخصوص میعاد تک انتظامی امور میں وسیع اختیارات سونپے جائیں گے[5]۔

اسلامی ریاست کی پارلیمان

اس ضمن میں مملکت کے رئیس کا فرض ہے کہ وہ اسلامی ریاست کے امور کی انجام دہی کے لیے مجلس شوریٰ قائم کرے جس کا کام انتظامی و تشریعی معاملات سے متعلق غور و فکر کرنا ہے[6]۔اس کے ارکان امیر کی اپنی مرضی و منشا کے مطابق منتخب نہیں کیے جائیں گے اور نہ ہی ہر کس و ناکس کو اس میں شامل کیا جائے گا بلکہ ان لوگوں کا

1۔ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، ص:21

2۔ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت نہیں جمہوریت، ماہنامہ میثاق، لاہور (اگست 1991ء)، ص40

3۔ایضاً

4۔ڈاکٹر اسرار احمد، نظامِ خلافت قائم ہو کر رہے گا، ہفت روزہ ندائے خلافت، لاہور (جنوری 1992ء)، ج1، شمارہ نمبر1، ص21 تا27

5۔ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام کے نظامِ عدل کے خدوخال، ماہنامہ میثاق، لاہور، (نومبر 1991ء) ج40، شمارہ نمبر1، ص19

6۔مودودی، اسلامی ریاست، ص366

انتخاب کیا جائے گا جن پر عوام الناس کو مکمل اعتماد ہو۔ حکومتی فیصلوں میں ان کے شریک ہونے سے یہ تسلی ہو جائے کہ ان لوگوں کے فیصلوں میں قوم کے جمہور دلی طور پر مطمئن ہیں[1]۔ سید مودودی کے مطابق مسلمانوں کی مجلس قانون ساز بھی ان لوگوں پر مشتمل ہونی چاہیے جو لوگوں کے معتمد ہوں اور اس مجلس کے اجماع سے بننے والے قوانین کو ہی مملکت میں نافذ کیا جائے گا[2]۔

عوام کی نظر میں قابل اعتماد لوگوں کی نشاندہی کرنے کے لیے سید مودودی نے کوئی مخصوص طریقہ نہیں بتایا ہے بلکہ ان کی رائے ایسا کوئی بھی مباح طرزِ انتخاب اپنایا جاسکتا ہے جو مغربی جمہوریت میں موجود اوچھے ہتھکنڈوں کی مانند نہ ہو۔ اگر شوریٰ کے ارکان کو ووٹوں کے ذریعے منتخب کیا جائے تو اس میں کوئی شرعی ممانعت موجود نہیں ہے[3]۔ صرف مردوں کو مجلس میں شامل کیا جاسکتا ہے اس میں عورتوں کی شرکت غلط ہے[4]۔

مجلس کے ارکان کی حیثیت صرف مشیر کی ہو گی اور امیر کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں کے ساتھ اتفاق اور اختلاف کرے[5]۔ مسلمان علماء نے خلافت راشدہ کے تعامل سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ امیر ریاست مملکت کے نظم کا ذمہ دار ہے اور اس کے لیے لازم ہے کہ وہ حلو عقد کے اہل افراد کے ساتھ مشورہ کرے لیکن وہ ان کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کے پاس "ویٹو" کا اختیار بھی موجود ہے[6]۔ عہد خلافت میں اس اصول پر عمل کرنا ممکن تھا لیکن اب انتظامیہ کسی صورت میں بھی مقننہ کے فیصلوں کی پابند قرار نہیں دی جاسکتی ہے[7]۔

ڈاکٹر اسرار احمد مولانا مودودی کے اس موقف سے متفق ہیں کہ اسلامی ریاست میں حکمران اپنی شوریٰ کے مشورے پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اگر اس کے پاس شوریٰ کے مشورے سے بہتر لائحہ عمل ہو تو اس کے لیے شریعت نے اپنی رائے پر عمل کرنا جائز قرار دیا ہے۔ ووٹوں کی گنتی کسی انسان کا موقف نہیں بدل سکتی ہے[8]۔

1۔ ایضاً، ص504

2 ۔ یہاں وہ ڈاکٹر اسرار احمد سے مختلف ہیں۔

3۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص47

4۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص43-46

5۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص354،353

6۔ ایضاً، ص:355،354

7۔ مودودی، خلافت وملوکیت، ص43

8۔ ڈاکٹر اسرار، اطاعت کا قرآنی تصور، ص43

اسلامی ریاست میں شخصی آزادی کی حدود

اسلام کو بطور ضابطہ حیات متعارف کرواتے ہوئے سید مودودی نے واضح کیا ہے کہ چونکہ اسلامی شریعت زندگی کے جملہ امور و معاملات کو محیط ہے اس لیے یہ انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے امور کو اس کی تعلیمات کے مطابق تشکیل دے۔ کوئی بھی شخص اپنے کسی کام کو نجی نہیں قرار دے سکتا ہے۔ اس ضمن میں اشتراکی یا فاشستی حکومت اسلامی تصورِ سیاست کے ساتھ جزوی طور پر مماثل ہے[1]۔

اس پہلو پر ڈاکٹر اسرار احمد سید مودودی کے ساتھ متفق ہیں۔ وہ جدید ذہن کے مطابق مذہب اور دین کو مترادف قرار دینے سے اختلاف کرتے ہیں اور اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں کہ اب دنیا بھر میں مذہب کا یہی تصور راسخ ہوتا جارہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا تصورِ دین ان کے سیاسی فلسفے کی بھرپور وضاحت کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> "مذہب کا تعلق واقعتا انسان کی شخصی، ذاتی اور نجی زندگی سے ہی ہے۔ اس معنٰی میں اسلام مذہب ہے ہی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام کی تعبیر کے لیے لفظ "مذہب" نہ کہیں قرآن مجید میں وارد ہوا ہے اور نہ ہی پورے کے پورے ذخیرۂ احادیث میں کہیں استعمال ہوا ہے۔ بلکہ ہر جگہ اصل اصطلاح "دین" ہی استعمال ہوئی ہے۔۔۔۔ موجودہ دَور میں جب مذہب کو انسانی زندگی کا محض ایک نجی معاملہ بنا دیا گیا تو دین کے جامع تصور یعنی اس کے نظامِ حیات ہونے کے تصور کی جگہ خالی ہو گئی[2]"۔

اسلامی نظام کے نفاذ کی اہمیت

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا پہلا نظریہ یہ ہے کہ اسلام چونکہ دوسرے ضابطہ ہائے حیات سے الگ ایک مستقل نظام رکھتا ہے اس لیے یہ اپنی فطرت کے اعتبار سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ دیگر ریاستی و سیاسی نظاموں کو ختم کر کے اس کا نفاذ کیا جائے۔ اس ضمن میں تمام مسلمان اجتماعی جدوجہد کر کے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے مصروف عمل ہو جائیں[3]۔

اس ضمن میں مولانا مودودی نے صراحت کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست میں امیر کا پہلا فریضہ یہی ہے کہ وہ بطور رئیس مملکت اسلامی اصولوں کے مطابق ریاستی نظام کو چلائے کیونکہ اسلامی ریاست کو غیر اسلامی ریاست سے ممتاز کرنے والی یہی ایک چیز ہے کہ اس میں احکامِ الٰہی نافذ ہوتے ہیں[4]۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص504

2۔ ڈاکٹر اسرار، مطالبات دین، ص83

3۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، (ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 2004ء)، ص:3/343

4۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص347

ریاست میں اصل اہمیت اسلامی نظام کی ہے اور اگر کوئی حکمران اس کے نفاذ میں بے ایمانی یا خیانت کا مرتکب ہوتا ہے تو مسلمان عوام کے پاس اس کی حکومت کا تختہ الٹ دینے کا اختیار ہے[1]۔اس عمل کے لیے بھی جمہوری طریقہ کار کو اختیار کیا جائے گا اور مسلمانوں کی شوریٰ کا بنایا ہوا لائحہ عمل ہی اپنایا جائے گا[2]۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے بھی اس نکتہ پر سید مودودی کے ساتھ اتفاق کیا ہے کہ ایسا حکمران جو حرام چیزوں پر نہ صرف خود عمل کر رہا ہو بلکہ ان کی ترویج بھی کرے تو اس کا معاملہ انتہائی تشویش ناک ہے۔ اسلامی ریاست کو اس سے خطرہ ہوتا ہے اس لیے اس کے خلاف خروج کرنا مسلمانوں کے لیے جائز ہو گا۔ جس گروہ کی جانب سے خروج کی ابتدا ہو اس کی تائید میں قوت فراہم کرنا بھی دوسرے مسلمانوں کے لیے جائز ہے[3]۔

یہاں سید مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کے مابین ایک اختلافی پہلو یہ ہے کہ مودودی کے مطابق حکمران کو معزول کرنے کا اختیار شوریٰ کے پاس ہو گا جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد عوام کی جانب سے خروج کو لازم قرار دیتے ہیں۔ان کا موقف ہے کہ مسلمان ممالک میں اس خروج کو بغاوت نہیں بلکہ تحریک کی صورت ملنی چاہیے جس کا منشور یہ ہو کہ ہمیں موجود حکمران قبول نہیں ہیں۔اس لیے ان کو معزول کر کے ان کی جگہ نئے حکمرانوں کا تقرر ہونا چاہیے[4]۔

اسلامی ریاست کی شہریت

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کا موقف ہے کہ اسلام صرف عبادات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس میں ریاست کا قانون بھی شامل ہے۔اس لیے جو شخص اسلام کے قیام کا خواہش مند ہے وہ محض نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کے لیے ہی نہیں بلکہ شریعت کے قوانین کے نفاذ کے لیے عملی طور پر مصروف عمل ہونے کا پابند بھی ہے[5]۔یہی وجہ ہے کہ کسی بھی مسلمان کے لیے اپنے ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے انفرادی و اجتماعی امور کے فیصلوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے قوانین کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے[6]۔

اس اعتبار سے اسلامی ریاست نظریاتی ریاست کہلاتی ہے جو سید مودودی کے مطابق جدید جمہوری ریاستوں سے مختلف ہے۔چنانچہ یہاں کے شہریوں کو بھی مسلمان اور غیر مسلم کی بنیاد پر تقسیم کیا جاتا ہے[7]۔اس اعتبار سے

1۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، ص43، 44، 69، 79

2۔ مودودی، خلافت وملوکیت، ص37

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، ص329

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، ص335

5۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص52

6۔ تفہیم القرآن، ص:2/638۔ اسلامی ریاست، ص:59، 163، 162

7۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص377، 374، 598، 587

مسلمانوں کے پاس ہی اسلامی ریاست کو چلانے کا اختیار ہے۔ وہی اس کی مقننہ اور شوریٰ کے ممبر بن سکتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے تمام کلیدی مناصب پر مسلمانوں کو ہی تعینات کیا جا سکتا ہے۔ غیر مسلم افراد کو انتظامی امور میں خدمات کا موقع تو دیا جا سکتا ہے لیکن رہنمائی کا کام ان سے نہیں لیا جا سکتا ہے۔ ان کو متعین حقوق دے کر ریاست کے اصولی نظام کے معاملات حل وعقد میں ان کی دخل اندازی کو روک دیا جاتا ہے[1]۔

اس پہلو پر ڈاکٹر اسرار احمد مولانا مودودی کے ساتھ متفق نظر آتے ہیں۔ ان کا بھی یہی موقف ہے کہ اسلامی ریاست کا نظام قرآن و سنت پر چلتا ہے اور اس کو وہی چلا سکتا ہے جو قرآن و سنت پر ایمان رکھتا ہو۔ جو شخص ان ماخذین شریعت اسلامیہ کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا وہ اس کی قانون سازی میں شریک ہونے کا اہل نہیں ہے[2]۔ انہوں نے اس ضمن میں دنیا کی دو بڑی جمہوریتوں یعنی امریکہ اور بھارت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امریکہ میں تمام شہریوں کو قانونی طور پر برابر قرار دیا گیا ہے لیکن عملی طور پر وہاں گورے اور کالے کا فرق آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح بھارت میں بھی برہمن اور شودر کے درمیان امتیاز کیا جاتا ہے۔ یہ کھلی منافقت ہے کہ قانون میں کچھ ہو اور عملی زندگی میں اس کے برعکس منظر پیش کیا جا رہا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مساوی شہریت کا نعرہ بہت مقبول ہے لیکن اسلامی ریاست میں "مخلوط قومیت کی نفی کرنا ہو گی"۔ اس کی توضیح میں انہوں نے لکھا ہے کہ کانگریس کی جانب سے متحدہ قومیت کے نعرے سے اختلاف کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایک جداگانہ شناخت کے ساتھ پاکستان حاصل کیا تھا۔ مسلمانوں کی قومیت ان کے دین کے ساتھ مربوط ہے[3]۔ اس کے بعد ڈاکٹر موصوف نے اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

سید مودودی کے مطابق مملکت کا دفاع صرف مسلمانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے اور ذمیوں کو ملکی تحفظ کے مصارف میں اپنا مالی حصہ جزیہ کی صورت میں ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ صرف ان کی اطاعت کا نشان ہی نہیں ہے بلکہ یہ ان کی فوجی خدمات کا بدل اور ملک کی حفاظت کا معاوضہ ہے۔ اس لیے جزیہ کی رقم کو صرف ان فوج پر خرچ کرنا چاہیے[4]۔

1۔ ایضاً، ص:617

2۔ ڈاکٹر اسرار، خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام، ص104

3۔ ایضاً، ص102

4۔ اسلامی ریاست، صفحہ نمبر 621۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد نے مولانا مودودی کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے قبل از تقسیم برصغیر یہ فتویٰ دیا تھا کہ انگریز کی فوج میں ملازمت کرنا اسلام میں جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔ اگر کوئی شخص انگریز کی فوج میں ملازمت اختیار کرے گا تو وہ کافر کو تقویت دے گا۔ مسلمان فوجیوں نے ہی پہلی جنگ عظیم میں یروشلم کا قبضہ جنرل ایلن بی کو دیا تھا۔ ان فوجیوں کا تعلق راولپنڈی اور جہلم کے ساتھ تھا۔ ان لوگوں نے خانہ کعبہ پر بھی حملہ کیا تھا (انفرادی نجات اور اجتماعی فلاح کیلئے قرآن کا لائحہ عمل، ص:28)

اب جب کہ ملک کے دستور میں یہ اصول طے پاچکا ہے کہ یہاں قرآن وسنت سے متصادم کوئی بھی قانون نہیں بنایا جائے گا اور بننے والے قوانین کی توثیق کا حتمی اختیار مسلمانوں کے پاس ہو گا[1] اس لیے اب شہری ملازمتوں میں غیر مسلموں کو داخل ہونے کی اجازت ہے۔ ان ملازمتوں پر لوگوں کے تقرر کے لیے مسلمان اور غیر مسلم کی تمیز نہیں کی جائے گی بلکہ میرٹ پر بنیاد پر ہر فرد کے انتخاب کا امکان موجود ہے[2]۔

اس جگہ بھی ڈاکٹر اسرار احمد نے مولانا مودودی کے ساتھ اتفاق کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم کو تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ تجارت اور صنعت و حرفت میں شامل ہونے کی آزادی ہو گی۔ وہ اپنی قابلیت اور میرٹ کی بنیاد پر سرکاری نوکری کے اہل ہوں گے۔ البتہ پالیسی ساز اداروں میں ان کو ملازمت نہیں دی جاسکے گی۔ انھوں نے یہ امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ صدارتی نظام ہونے کی بنا پر کسی غیر مسلم کو صدر تو نہیں بنایا جا سکتا ہے البتہ وزارت دی جاسکتی ہے[3]۔

اسلامی ریاست کے قیام کی ناگزیریت

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے اسلامی ریاست کا قیام ناگزیر قرار دیا ہے۔ اس کا موقف ہے کہ یہ صرف سیاسی و سماجی ضرورت ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک دینی فریضہ ہے کیونکہ اسی کے ذریعے ایک مسلمان کے لیے اپنے ایمان کے مطالبات اور تقاضے پورا کرنا ممکن ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھی دنیا میں اسی لیے مبعوث فرمایا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کا دین عملی صورت میں قائم کر کے اس کے دیے ہوئے قوانین کا اجرا کریں[4]۔

اس موقف سے ڈاکٹر اسرار احمد اتفاق کرتے ہیں اور ان کا بھی یہی خیال ہے کہ اسلام کی فطرت میں غلبہ ہے اور یہ غلبہ ایک ایسی ریاست کی تشکیل کا طالب ہے جس کو اسلام کی نشاۃ کا مرکز بنایا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان کے دستور پر سخت تنقید کرتے ہیں تاکہ اس کو اسلامی ریاست قرار دینے والی فکر کے ان پہلوؤں کی نشاندہی کی جاسکے جو دستورِ پاکستان کے حقیقی پہلوؤں سے لاعلمی یا اغماض پر مبنی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:

> "یہ دین اپنا نفاذ اور غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دستور اور قانون بے معنیٰ ہے جو کہیں نافذ نہیں۔ ہمارے ملک کے 1954 اور 1956 کے جو دستور رکھے ہوئے ہیں، کیا وہ واقعی دستور کہلائے جاسکتے ہیں۔ جبکہ وہ نافذ ہی نہیں[5]"۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص624

2۔ مودودی، اسلامی قانون، ص32، 31

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام، ص105

4۔ تفہیم القرآن، ص:2/638

5۔ ڈاکٹر اسرار احمد، مطالبات دین، ص83

"یہ عجب طرفہ تماشا ہے کہ دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کے نام سے جو قوم بس رہی ہے، وہ دعویٰ تو اس بات کا کرتی ہے کہ اصل دستور اور قانون خدا کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہے، لیکن یہ عجیب شتر گربگی ہے کہ ان کا عمل اس دعوے کے بالکل برعکس ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا عطا کردہ دستور و قانون ان کی عملی و اجتماعی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتا[1]"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حضرات کے مطابق اسلام اپنی اصل میں ایک نظام تجویز کرتا ہے اور اس کے نفاذ کے لیے اسلامی ریاست کی تشکیل کو لازم قرار دیتا ہے۔ ایک ایسی ریاست جس کی انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ اسلامی تعلیمات کے عین مطابق چل رہی ہوں۔ اس تصور کی بنیاد میں پوشیدہ اس تشویش کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے جو اسلامی ریاست کی غیر موجودگی کے بارے میں مسلمان ذہن میں پیدا ہو سکتی ہے۔

اسلامی ریاست کے انتظامی قانون کی تشکیل

سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اسلامی ریاست کے لیے انتظامی قانون کو لازم قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس قانون کی تشکیل کے لیے ہمارے پاس دو مصادر ہیں۔ (1) نبی اکرم ﷺ کی سیرت۔ (2) خلفائے راشدین کی انتظامی سرگرمیوں کے نظائر[2]۔

انتظامی قانون کے ضمن میں سید مودودی نے ایک اہم نقطہ یہ بھی اٹھایا ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلفاءِ راشدین میں آپ ﷺ اور خلفاء کو عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ تینوں پر کلی اختیار حاصل تھا لیکن اب چونکہ اس معیار کے تقویٰ کا حکمرانوں میں پایا جانا ممکن نہیں ہے اس لیے اب مملکت اسلامیہ کے حکمران یا صدر کے اختیارات کو انتظامی قانون کی رو سے محدود کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اختیارات کو محدود کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صدر کے مزاج میں آمریت پیدا نہ ہو سکے۔ اس لیے قانونی طور پر ان کو مقدمات کی براہ راست سنوائی اور فیصلہ سازی کے عمل سے روکا جا سکتا ہے تاکہ ان کی طرف سے کسی جانب داری کا مظاہرہ نہ ہو سکے[3]۔

1۔ ایضاً، ص84، 83

2۔ مودودی، خلافت و ملوکیت، ص102، 13

اس ضمن میں تفصیلات کے لیے دیکھیے: سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 2006ء۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامی دستور کی تدوین، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 2005ء

3۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص621

ڈاکٹر اسرار احمد اس سے اتفاق کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ عہد خلفاء میں انتظامیہ اور مقننہ کی دوئی کا کوئی تصور نہیں تھا[1]۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد صدارتی نظام کے حامی نظر آتے ہیں اور ان کے مطابق:

> "اصولی طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جدید ریاست کے جو تین گوشے عدلیہ' انتظامیہ اور مقننہ مقرر کیے گئے ہیں' صدارتی نظام میں بالکل علیحدہ ہوتے ہیں۔ انتظامیہ کا سربراہ صدر منتخب ہونے کے بعد مقننہ (کانگریس) کا دست نگر نہیں ہوتا[2]"۔

اسلامی ریاست کے دستور کی تشکیل

انتظامی قانون کے بعد اسلامی ریاست کے دستور کی تشکیل کے لیے سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے جن مصادر سے آئین سازی کے اصولوں کو اخذ کیا ہے وہ (1) قرآن مجید (2) سنت رسول ﷺ اور (3) خلافت راشدہ کے نظائر و تعامل ہیں[3] جن معاملات میں شریعت خاموش ہو ان کے بارے میں قانون سازی کے لیے مسلمانوں کا اجماع ہونا لازم ہے۔ جن قوانین کی تعبیر مطلوب ہو گی ان کی تعبیر کے لیے ہر وہ مسلمان اہل ہو گا جس میں اجتہاد کی صلاحیت موجود ہو[4]۔

چنانچہ جن معاملات کے ضمن میں قرآن و سنت میں واضح ہدایات موجود ہین ان کے بارے میں مسلمان ریاست کی قانون ساز مجلس کو قانون سازی کی اجازت نہیں ہو گی البتہ اس کی تعبیر و تشریح کر کے ضمنی قواعد و ضوابط بنائے جاسکتے ہیں۔ جن معاملات سے متعلق شارع نے قطعی احکامات صادر نہیں فرمائے ہیں اور نہ ہی ان کے بارے میں اصولوں کا تعین کیا ہے، ان میں اصول عامہ اور اسلام کی روح کے مطابق قانون ساز اسمبلی کے پاس قانون سازی کا اختیار موجود ہے[5]۔ اگر مقننہ ایسا کوئی قانون پاس کر دے جو اسلامی نصوص کے ساتھ متصادم ہو تو اس کو حدود اللہ سے تجاوز قرار دیا جائے گا[6]۔

1۔ ڈاکٹر اسرار، احمد، خلافت کی حقیقت اور عصر حاضر میں اس کا نظام، ص 83

2۔ ایضاً، ص 88

3۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص 285

4۔ مودودی، خلافت و ملوکیت، ص 44، 43

5۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص 345

6۔ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، ص 47

سید مودودی کے مطابق قانون سازی میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا[1] البتہ اس کا مقد پچھلی نسل کی تعمیر کردہ فکری عمارت کو منہدم کر کے نئی عمارات تعمیر کرنا نہیں ہے[2]۔ اس لیے وہ انفرادی اجتہار کے بجائے اجتماعی اجتہاد کو زیادہ قابل اعتماد قرار دیتے ہیں[3]۔ یہ اجتماعی اجتہاد مسلمانوں کی مجلس شوریٰ اجماع، جمہور، اکثریت کی رائے سے سامنے آنے والی تعبیر، استنباط و اجتہاد، قیاس، مصلحت مرسلہ یا استحسان کو منتخب کر کے اس کو قانون بنا سکتی ہے[4]۔ اس طرح کے اجماع سے سامنے آنے والے فیصلے اسلامی ریاست میں قانون کا درجہ پا کر قابل نفاذ ہوتے ہیں[5]۔

ڈاکٹر اسرار احمد بھی اس قانونی پہلو کے حوالے سے سید مودودی کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ اسلامی ریاست میں کوئی بھی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ یہاں قانون سازی پر مامور ہر ادارہ بنیادی اسلامی مبینہ قوانین سے ہٹ کر دیگر قوانین بنانے کا مجاز ہے۔ اس لیے اسلامی ریاست میں دستور طے کر دیا جائے گا کہ

"Legislature's authority is limited by the injections of the Quran and the Sunnah"[6]

اسلامی ریاست کا عدالتی نظام

مولانا مودودی کے مطابق اسلامی ریاست کا عدالتی نظام اس کی انتظامیہ کے زیر اختیار نہیں ہے بلکہ یہ اپنی نوعیت میں مکمل طور پر آزاد ہے اور مسلمانوں کا خلیفہ بھی اس کے فیصلوں پر عمل کرنے کا پابند ہے[7]۔ اس کے ساتھ ساتھ عدلیہ بھی اسلامی قانون کی پابند ہے[8]۔ اس کے پاس یہ بھی اختیار ہے کہ وہ قانون ساز ادارے کے ان فیصلوں کو رد کر دے جو کتاب و سنت کے خلاف ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی یہ تجویز دیتے ہیں کہ مقننہ کو بھی عدلیہ کے فیصلوں کا پابند کیا جانا چاہیے[9]۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص350،349

2۔ ایضاً، ص479،478

3۔ ایضاً، ص563

4۔ ایضاً، ص504،480

5۔ ایضاً، ص504

6۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام، ص90

7۔ مودودی، خلافت و ملوکیت، ص43

8۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص350،349

9۔ ایضاً، ص367

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس نقطہ سے اتفاق کیا ہے کہ مقننہ کا بنایا ہوا کوئی بھی قانون حتمی نہیں ہو گا۔ کیونکہ مقننہ کا بنایا ہوا کوئی بھی قانون جو قرآن و سنت سے متصادم ہو گا وہ ممنوع ہی تصور کیا جائے گا" چاہے اس قانون کو مقننہ کے تمام ارکان ہی کی حمایت حاصل کیوں نہ ہو"[1]۔

انہوں نے یہ تجویز بھی دی ہے کہ کہ عدلیہ کو کسی بھی قانون کی جانچ پرکھ کا اختیار دیا جانا چاہیے۔ اس زمانے کے دساتیر کی رو سے حکومت یا شہری باشندے کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے یا قانون ساز ادارے اور ریاستی باشندے کے مابین اختلاف ہو جائے تو اس متنازعہ مسئلہ میں عدالت کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ اسی طرح عدالت کے اختیار میں ہوتا ہے جس طرح دو شہریوں کے مابین فیصلہ کرنے میں عدالت با اختیار ہوتی ہے[2]۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کسی بھی دستور کے غیر اسلامی ہونے کی صورت میں علماء عدالت کی طرف رجوع کریں:

> "ایک نئی مقننہ (Legislative) ہو گی جسے ہر میدان میں اجتہاد کرنا ہو گا۔ طے یہ کرنا ہو گا کہ قانون سازی میں کتاب و سنت کی حدود سے تجاوز نہیں ہو گا۔ اگر تجاوز ہوتا ہے تو ہر عالم دین کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ عدالتِ عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹائے اور وہاں جا کر یہ ثابت کرے کہ یہ قانون کتاب و سنت کے خلاف ہے[3]"۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے ایک مثال پیش کی ہے کہ:

> " فرض کیجیے ایک ایگزیکٹو آرڈر آیا ہے' اس کے خلاف ایک شخص کھڑا ہو جاتا ہے کہ یہ تو آئین اور دستور (constitution) کے خلاف ہے' ہم اس ایگزیکٹو آرڈر کو نہیں مانیں گے۔ اس صورت میں آپ آئینی عدالتوں (constitutional courts) یا سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ پھر وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط![4]"۔

سید مودودی کے مطابق جن لوگوں کے پاس اجتہاد کا حق ہے ان میں شریعت اسلامیہ پر ایمان، عربی زبان میں مہارت، اسلامی شریعت کی جزئیات اور کلیات کا علم، سابقہ مجتہدین کے کام سے واقفیت، عملی زندگی میں پیش آنے والے امور کا فہم، بہترین سیرت و کردار کا ہونا لازم ہے[5]۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، ص:6/469

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد، خلافت کی حقیقت اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام ص95

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد، بصائر، (لاہور: مکتبہ خدام القرآن)، ص44

4۔ ڈاکٹر اسرار احمد، اَربعینِ نَوَوِی، (لاہور: مکتبہ خدام القرآن)، ص590

5۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص469، 468

فصل سوم

موجودہ اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو

عصرِ حاضر میں مسلمان یا غیر مسلم کی بنیاد پر نہیں بلکہ رنگ، نسل، زبان اور علاقائیت کی بنیاد پر قومی ریاستیں تشکیل دی گئی ہیں۔ اگر اسلامی ریاست کی تشکیل کی جائے تو یہ ان چیزوں سے موراء اور اعلیٰ بنیاد یعنی اسلامیت کی بنیاد پر قائم ہو گی۔ اس کا نظام قرآن مجید اور سنت رسول کی روشنی میں تشکیل دیا جائے گا۔ چنانچہ محض مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہونے کی بنیاد پر کسی بھی ریاست کو اسلام نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے فقہی اور روایتی ادب میں لفظ "اسلامی ریاست" یا "المملکۃ الاسلامیۃ" کے بجائے دار الاسلام کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی کے مطابق دار الاسلام ایسی ریاست کو کہا جاتا ہے جہاں:

1. مسلمانوں کو اسلامی شعائر کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے مطلق آزادی دی جائے۔
2. سماجی و قانونی سطح پر اسلامی شریعت کی بالادستی ہو۔
3. سیاسی اعتبار سے تمام مسلمان خود مختار ہوں[1]

شاہ عبد العزیزی دہلوی نے دار الاسلام اس ریاست کو قرار دیا ہے جس میں مسلمان حاکم کے فرامین کو اسلامی شریعت کے مطابق آزادانہ طور پر جاری کیا جاتا ہے[2]۔ شاہ عبد العزیز نے یہ تعریف انگریز حکمرانوں کے عہد میں پیش کی تھی جس کے مطابق برصغیر دار السلام نہیں تھا[3]۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد مسلمان ممالک اقوام کی بنیاد پر منقسم ہو چکے ہیں اور آج کے عہد میں نئی سیاسی اصطلاحات رائج ہو چکی ہیں جن کی وجہ سے دار الاسلام، دار الحرب اور دار الصلح جیسی روایتی اصطلاحات اجنبی معلوم ہوتی ہیں[4]۔ مسلمان ممالک اب سیکولر ریاستوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں اس لیے ان میں کسی کو بھی اسلامی ریاست قرار دینا مشکل ہے۔ چنانچہ اب اسلامی ریاست وہ ہو سکتی ہے:

1. جو نسل، علاقے، زبان یا قومیت کے نظریات پر قائم نہ کی جائے بلکہ اس کا قیام اسلامی نظریہ حیات کی بنیاد پر ہو۔
2. جہاں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر شریعت اسلامیہ کے احکامات کو عملی طور پر نافذ کیا گیا ہو۔

1۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، اسلام کا قانون بین الممالک (خطبات بہاولپور-2)، (اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، 1997ء)، ص 53

2۔ شاہ عبد العزیزی، فتاویٰ عزیزی، (مطبع مجتبائی، دہلی، 1341ھ)، ص 16

3۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی نے اس پر تفصیلی مباحث پیش کیے ہیں۔ دیکھیے:

Dr. Mehmood Ahmed Ghazi, Islamic Renaissance in south Asia, 17-7-1867, Islamic Research Institute, Islamabad, (2002), P. 164-180

4۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، دور جدید کے چند اجتہاد طلب مسائل، (الشریعہ، گوجرانوالہ)، ج 4، شمارہ نمبر 13، اپریل 2002ء، ص 16، 15

3. جس کے اساسی دستور اور قانون اسلامی شریعت کے اصولوں کی بنیاد پر تشکیل دیے گئے ہوں[1]۔
4. جس کا حکمران خود مسلمانوں میں سے ہی ایک باشرع فرد ہو اور اس کی سربراہی مسلمانوں کے پاس ہی ہو۔اس حکمران کا انتخاب کرتے وقت جمہور امت کی مرضی کو ملحوظ رکھا گیا ہو[2]۔
5. جس کے نظم ونسق کو شورائیت کی بنیاد پر چلایا جارہا ہو۔یہ شوریٰ مقننہ یا انتظامیہ کی صورت میں انتخابی عمل کے ذریعے قائم کی گئی ہو۔

جس کو اشرافیہ، متوسط یا ادنی طبقات کی بنیاد پر انسانی آبادی کو تقسیم کر کے قائم نہ کیا گیا ہو بلکہ اس میں سماجی عدل ومساوات کی بنیاد پر سب کو مساوی قانونی حقوق دیے گئے ہوں۔چنانچہ اس ورت میں وہاں کوئی ایسا استحصالی اور مراعات یافتہ طبعہ موجود نہ ہو جو موروثی یا خاندانی اقتدار کا حامل بن کر مسلسل حکمرانی کے منصب پر فائز رہے[3]۔

یہ فرق بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اسلامی ریاست اور مسلم ریاست ایک ہی ریاست کے نام نہیں ہیں بلکہ ان کے مابین ایک اساسی اور اصولی فرق ہے۔علامہ محمد اسد کے مطابق جس ریاست میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو اور وہاں حکومت کی زمامِ کار بھی مسلمانوں کے پاس ہو لیکن وہاں نافذ ہونے والا قانون اسلامی شریعت کے مطابق نہ ہو تو ایسی رہاست کو مسلم ریاست قرار دیا جائے گا۔اس کو اسلامی ریاست سے موسوم نہیں کیا جا سکتا ہے۔علامہ محمد اسد نے واضح کیا ہے کہ اس تناظر میں مسلمانوں کی تاریخ میں خلافت راشدہ کے بعد قائم ہونے والے مسلمانوں کے معاشروں کو بھی اسلامی ریاست کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ان میں بنو امیہ اور بنو عباس سمیت دیگر مسلمان حکومتوں کے ساتھ ساتھ جدید مسلم ممالک بھی شامل ہیں[4]۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ایسی کسی حکومت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے جو بادشاہت اور ملوکیت کی بنیاد ہر غیر جمہوری انداز میں قائم کی گئی ہو۔موروثی بادشاہتیں اسلامی تصور سیاست کے مطابق اسی طرح حرام ہیں جس طرح شرک کو حرام قرار دیا گیا ہے[5]۔

1۔کسی بھی ریاست کو محض اس وجہ سے اسلامی نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔اسلامی ریاست صرف وہی ہے جس میں مذکورہ تینوں خصائص بکمال واتمام موجود ہوں۔دیکھیے:

Ismail Al-Raji Al-Farooqi, Viability of Islamic State, Dr. Ishtiaq Hussain Qureshi Chair, University of Karachi(1987), P: 117, 120)

2۔یہ شرط اخوان المسلمون کے رہنما الشیخ عبد القادر عودہ نے قائم کی ہے۔عودہ کے ان افکار کی تفصیل کے لیے دیکھیے:

Richard Mitchel, The society of Muslim brothers, Oxford university press, London (1969), P: 246

3. Road to Mecca, P: 302-304

4. Road to Mecca, P: 177-178

5. Ibid, P: 304

چنانچہ حقیقی اسلامی ریاست صرف عہد نبوی میں ہی قائم کی گئی تھی کیونکہ وہ کسی قومی، وطنی، لسانی یا نسلی نظریے کی بنیاد پر وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ اس کی اساس میں ایک مضبوط عقیدہ اور ایک مکمل ضابطہ حیات تھا۔ وہاں نہ تو کوئی مراعات یافتہ گروہ تھا اور نہ ہی اشرافیہ، متوسط اور ادنی کی بنیاد پر انسانوں کو منقسم کیا گیا تھا۔ خود نبی اکرم ﷺ کے خانوادے کے لیے امتیازی مراعات موجود نہیں تھیں۔ قانون کی نظر میں سب برابر تھے اور حقوق و فرائض کے حوالے سے ان کے مابین کوئی تفریق نہیں تھی۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی انہی بنیادوں پر اسلامی معاشرے کی تشکیل کرنے کے بعد اکا انتظام سنبھالا تھا اس لیے ان کے عہد میں مسلمانوں کی ریاست کو اسلامی ریاست کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید ابو الاعلیٰ مودودی کے موقف کے مطابق اسلامی ریاست وہی ہے جو خلافت علی منہاج النبوۃ کے نظام کی بنیاد پر قائم کی گئی ہو اور اس میں حاکمیت الٰہی کے بارے میں کوئی اختلاف موجود نہ ہو[1]۔

انہوں نے واضح کیا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد کی حکومتوں میں اسلامی قانون موجود تھا لیکن ان میں اسلامی دستور کے کئی حصے توڑ دیے گئے تھے اور ان حکومتوں کی روح اسلام سے ہٹ چکی تھی[2]۔ یہ نہ تو مکمل طور پر اسلامی تھیں اور نہ ہی ان کو مکمل طور پر غیر اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ ان میں دو امور میں اسلامی تعلیمات کی مسلسل مخالفت کی جارہی تھی:

1. ان میں کسی بھی حکومت میں امارت انتخابی نہیں تھی بلکہ زیادہ تر امارتیں موروثی اور خاندانی تھیں۔
2. ان میں مجلس شوریٰ بہت زیادہ حد تک غیر موثر ہو کر رہ چکی تھی اور حکومت کا نظام باہمی مشورے کی بنیاد پر نہیں چلایا جاتا تھا۔

اس کے علاوہ باقی قانون اسلامی ہی تھا اور شریعت کو ہی اس کا مصدر سمجھا جاتا تھا۔ عدالتیں اسی کے مطابق فیصلے صادر کرتی تھیں اور کسی مسلمان حکمران نے اس قانون کو ہٹا کر اس کی جگہ کوئی انسانی قانون نافذ نہیں کیا تھا[3]۔

اسلامی ریاست اور مسلمان ریاست کے درمیان یہی فرق ہے کہ اسلامی ریاست میں قانون اسلامی شریعت کی روشنی میں تشکیل دیا جاتا ہے جب کہ مسلمان ریاست میں آبادی کے اعتبار سے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے لیکن وہاں قانون مکمل طور پر اسلامی نہیں ہوتا ہے[4]۔

1۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص285

2۔ ایضاً، ص517

3۔ ایضاً، ص528، 527

4۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: سید مصباح الدین، اسلامی ریاست کا تصور، فکر و نظر، اسلام آباد، جنوری تا مارچ، 1988ء، ص: 195۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی، اسلام کا قانون بین الممالک، (اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، 1998ء)، ص: 179، 176، 161

اسلامی ریاست کی ماہیت

اسلامی ریاست میں تھیاکریسی کی ایک صورت یوں ہے کہ اس میں قانون سازی کا حقیقی سرچشمہ الٰہی تعلیمات ہیں۔ یہ مغربی پاپائیت کی بنیاد پر قائم ہونے والی تھیاکریسی کی کلی نفی کرتی ہے۔ اسلامی ریاست میں پاپائیت کے بجائے جمہوریت سے ہم آہنگ اور مماثل نظام مروج ہو گا۔ البتہ یہ جمہوری نظام مغربی جمہوریت کی مانند نہیں ہو گا کیونکہ مغربی جمہوریت میں قوانین کا سرچشمہ عوام ہیں۔

اسلامی ریاست کا نظام وقت کی ضرورتوں کے مطابق تشکیل دیا جائے گا اور اس کو پارلیمانی، وفاقی یا وحدانی صورت میں ڈھالا جا سکتا ہے کیونکہ اسلام کسی مخصوص وضع کا ریاستی نظام اختیار کرنے کی تاکید نہیں کرتا ہے بلکہ اسلامی نظریے کی بنیاد پر، اسلامی قوانین کے نفاذ کے ساتھ، باہمی مشاورت اور حکومت کے نیک مقاصد کے حصول کے لیے کوئی بھی مناسب اور معقول نظام اسلامی ہی ہو گا۔ اسلام نے اہلِ ایمان کو وہ بنیادی اصول و ضوابط بتا دیے ہیں جو اسلامی ریاست کے نظام میں اساسی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ دستور سازی کے بارے میں تمام سرگرمیوں اور حکومت کے معاملات کا کام اہلِ ایمان کی اجتہادی بصیرت پر چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا کوئی بھی سیاسی وضع قطع اختیار کی جاتی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ وہ شریعت کے محکم اور واضح قوانین کے ساتھ موافق ہو۔

اسلامی ریاست کی تشکیلِ نو کے عمل میں اگر غیر مسلموں کے ممالک کے مثبت پہلوؤں کو اپنانا پڑے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کیونکہ اس عمل کا سرا سر دارومدار جلبِ منفعت پر ہے[1]۔ چنانچہ معاصر اسلامی ریاست میں بنایا جانے والا دستور خلافت راشدہ کے زمانے میں عمل میں آنے والے دستور سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اس کی بنا پر ریاست کی اسلامیت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔

یہ کہنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اسلام کا دستوری قانون یا سیاسی نظام کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت حرکی ہے۔ اسلام نے حکومت و مملکت کے پہلو میں مسلمانوں کو اساسی اصول فراہم کر دیے ہیں اور

1۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امت کی خیر کے لیے اہلِ ایران کے نمونے پر محکمہ مال یا دیوان کی تشکیل فرمائی تھی۔ اسی طرح آپ رضی اللہ عنہ نے مفتوح علاقوں کی اراضی کو مجاہدین کے مابین تقسیم کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ شرعی نظم اور قانون کے قطعاً مخالف نہیں تھے۔ اس لیے آپ رضی اللہ عنہ کے بنائے ہوئے قوانین کو ناف العمل قرار دیا گیا تھا البتہ ان کے مذکورہ فیصلے مستقل نوعیت کے قانون کی حیثیت سے قبول نہیں کیے گئے تھے بلکہ ان میں تبدیلی اور تغیر روا رکھا جا سکتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: Muhammad Asad, Principle of State, P: 23,24

اجتہاد کی مدد سے ہر زمانے کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دسوری قانون کی تشکیل کے عمل میں ان اصولوں کو ملحوظ رکھا جائے گا[1]۔

اسلامی ریاست میں حاکمیت اعلیٰ کا تصور

تحریکِ اسلامی کے بارے میں ایک سوال یہ ہے کہ اس نے اپنے اساسی پیغام میں حاکمیتِ الٰہ کو نمایاں اور مرکزی مقام کیوں دیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے قبل مناسب ہو گا کہ ''حاکمیتِ الٰہ'' کی اصطلاح کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ اس اصطلاح کا مفہوم دستورِ جماعت اسلامی ہند میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''بنیادی عقیدہ لا الٰہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ ہے۔ یعنی الٰہ صرف اللہ ہی ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس عقیدے کے پہلے جز یعنی اللہ تعالیٰ کے واحد الٰہ ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی اللہ ہم سب انسانوں کا معبود برحق اور حاکمِ تشریعی ہے، جو ہمارا اور اس پوری کائنات کا خالق، پروردگار، مدبر، مالک اور حاکمِ تکوینی ہے۔ پرستش کا مستحق اور حقیقی مطاع صرف وہی ہے اور ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔''[2]

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ نہ سمجھے، کسی کو بہ اختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز تسلیم نہ کرے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور ان تمام اطاعتوں کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ کی اطاعت اور اس کے قانون کے تحت نہ ہوں۔ کیوں کہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو فی الواقع مالکیت اور حاکمیت کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت مانے اور صرف اسی ضابطے کو ضابطہ تسلیم کرے، جو اللہ کا مقرر کردہ ہو، یا اس کے احکام و ہدایات کے تحت ہو، اور جو اس کے خلاف ہو، اسے رَد کر دے۔

1۔ مولانا محمد تقی امینی، احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، (اسلامک بک کارپوریشن، اسلام آباد، 1992)، ص: 45۔

2۔ مولانا محمد حنیف ندوی، اسلام کا سیاسی تصور، (الاعتصام، گوجرانوالہ، مارچ 1950ء)، ص: 3 تا 7

اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی کو اصل حجت، سند اور مرجع قرار دے۔ جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو، اسے اختیار کرے اور جو اُن کے خلاف ہو اسے ترک کر دے[1]۔

مندرجہ بالا تصور حاکمیتِ الٰہ، قرآن مجید سے اخذ کیا گیا ہے[2]۔ قرآن مجید کی ان صریح تعلیمات کی روشنی میں معقول موقف وہی ہے جو تحریکِ اسلامی نے اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ کہ حاکمیتِ الٰہ کو دینی نظامِ تصورات میں مرکزی اور نمایاں مقام حاصل ہونا چاہئے۔

اسلامی ریاست میں قانون سازی

مغربی ممالک میں اقتدار اعلیٰ عوام کے پاس ہے اور وہ اپنی منشا سے یہ کسی حکومتی ادارے یعنی پارلیمنٹ کو سونپ دیتے ہیں۔ اس پارلیمنٹ کو قانون سازی کے لا محدود اور مطلق اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور یہ ریاست کا اعلیٰ ترین طاقت ور ادارہ شمار کیا جاتا ہے[3]۔

اسلامی ریاست اقتدار اعلیٰ کے اس تصور کو تسلیم نہیں کرتی ہے کیونکہ یہاں قانون سازی اور حاکمیت کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے[4]۔ جب کہ مسلمانوں کے پاس یہ اقتدار بطور نیابت و خلافت ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کو ایک اہم امانت تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں یا ان کی پارلیمان کے پاس قانون سازی اور حکمرانی کا لا محدود یا مطلق اختیار نہیں ہے۔

اسلامی ریاست میں حکومت کی تشکیل

اسلامی ریاست میں حکومتی سربراہ خود مسلمانوں میں سے ہی ہو گا اور اس کا تقرر مسلمانوں کی باہمی مشاورت کے ذریعے عمل میں آئے گا[5]۔ یہاں کوئی بھی فرد طاقت کے زور پر حکومت پر قابض ہونے کا مجاز نہیں ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو ریاست مدینہ میں نبی اکرم ﷺ کو انصار اور مہاجرین نے باہمی رضا مندی کے ساتھ ایک عمرانی معاہدے کی صورت میں اپنا حکمران تسلیم کیا تھا۔ چنانچہ اگر کوئی زبردستی مسلمانوں کی ریاست پر قابض ہو جائے تو اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب نہیں ہو گی۔ اس صورت میں دو طریقے سامنے آئے ہیں:

1۔ دستورِ جماعت اسلامی ہند، دفعہ ۳

2۔ البقرہ:107۔ الانعام:57۔ الشوریٰ:10۔ یوسف:40۔ الاعراف:3

3۔ محمد ہاشم قدوائی، یورپ کے سیاسی مفکرین، (آواز فاؤنڈیشن برائے تعلیم، لاہور، س۔ن)، ص50

4۔ اسلام کے نظریہ اقتدار اعلیٰ کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیے، غازی حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت، ص:159 تا166

5۔ سید مودودی بھی اسی موقف کے حامی ہیں اسلامی ریاست، ص:358 تا362۔ تفہیم القرآن، ص:4/509-510

فتنہ وفساد کے اندیشے کے پیش نظر ایسی حکومت کے خلاف خروج نہیں کیا جائے گا بلکہ باامر مجبوری اس کی اطاعت کی جائے گی[1]۔

غیر نمائندہ حکومت کے خلاف خروج کیا جائے گا اور اس کے خلاف سخت مزاحمت کی جائے گی[2]۔

طریق انتخاب

دنیا میں بعض ممالک یں عوام الناس کی جانب سے منتخب مجلس کے ارکان اپنی کثرت رائے کے ذریعے حکمران کا انتخاب کرتے ہیں جب کہ بعض ممالک میں عامۃ الناس بات خود ریاست کے حکمران کو منتخب کرتے ہیں۔اسلام نے اس ضمن میں کسی مخصوص طریقے کو مروج نہیں کیا ہے بلکہ حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمان کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ چاروں خلفاءِ راشدین کے انتخاب کے لیے مسلمانوں نے الگ الگ طریقہ اختیار کیا تھا۔معاصر حالات کے مطابق اسلامی نقطہ نظر سے دوسرا طریقہ زیادہ موزوں ہے[3]۔

اسلامی ریاست میں سربراہی کے لیے جو شخص اہلیت رکھتا ہے اس میں متعدد شرائط مسلمان علماء کی جانب سے تجویز کی گئی ہیں۔امام ابو الحسن الماوردی، محمد بن حسین الفراء حنبلی اور امام بدر الدین ابن جماعۃ کے مطابق اس شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ:

- آزاد ہو۔
- اعلیٰ اخلاق کا مالک ہو۔
- بالغ ہو۔
- عاقل ہو۔

1۔الماوردی، احکام السلطانیہ، ص34، 33

قاضی ابو یعلیٰ محمد بن الحسین الفراء، احکام السلطانیہ، شرکۃ، (مطبع مصطفی البابی الحلبی، القاہرہ، 1386ء)، ص:38، 23، 22

بدر الدین ابن جماعۃ، تحریر فی الاحکام فی تفسیر اہل الاسلام، (رماسۃ الحاکمۃ الشرعیۃ والشؤون الدینیہ، قطر، 1411ء)، ص:55 تا 51

شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفا، ص:1 / 531، 26، 24 تا 536

مولانا ادریس کاندھلوی، دستور اسلامی مع نظام اسلام، (مکتبہ عثمانیہ، لاہور، س۔ن)، ص:37، 36

مولانا ابو الکلام آزاد، اسلام اور جمہوریت، (طیب پبلشرز، لاہور، س۔ن)، ص:31 تا 47

مولانا ابو الکلام آزاد، مسئلہ خلافت، ص:55

2 محمد رشید رضا، امامت عظمیٰ، (مترجم: ابو الفتح عیزی)، (محمد سعید اینڈ سنز، کراچی،، س۔ن)، ص:86

Ismail Raji Al-Faruqi, Structure of Islamic State, P. 136-138

3 مولانا محمد اسحاق سندیلوی، اسلام کا سیاسی نظام، (نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1989ء)، ص:104

جاوید احمد غامدی قانون سیاست، (المورد، لاہور،)، ص:38

- اس میں ثابت قدمی، اولوالعزمی، تواضع، شجاعت، سخاوت اور عدالت ایسے اوصاف موجود ہوں۔
- جسمانی طور پر وہ صحت مند اور اور اعضائے جسم سلامت ہوں۔
- دینی علوم کا ماہر ہو اور اس میں اجتہاد کی قابلیت موجود ہو۔
- نیز وہ صائب الرائے ہو اور اس میں عام اور پیچیدہ مقدمات کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔
- اس شخص کا نسبی طور پر قریشی ہونا بھی لازم ہے[1]۔

امام غزالی کا موقف ہے کہ اس شخص میں اجتہاد کی صلاحیت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ یہ کمی اس کے مشیروں میں موجود علماء کے ذریعے پوری کی جاسکتی ہے۔ نیز غزالی کے مطابق اس شخص کا شجاع ہونا بھی لازم نہیں ہے کیونکہ شجاع اور بہادر مشیروں کی موجودگی میں یہ کمی بھی پوری ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک امیر میں "ورع" کا پایا جانا لازم ہے[2]۔

ابن خلدون کے مطابق امیر کا قریشی ہونا بھی لازم نہیں ہے البتہ اس میں چار اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے:

1. اعضاء وجوارح کی سلامتی۔
2. کفایت
3. عدالت
4. علم

ابن خلدون نے الماوردی کی طرح یہ شرط بھی رکھی ہے کہ خلیفہ کو باعلم ہونا چاہیے اور اس میں اجتہاد کی صلاحیت کا پایا جانا ضروری ہے[3]۔

امام ابن تیمیہ کے مطابق خلیفہ کو اصابت رائے کا حامل ہونا چاہیے البتہ اس میں اجتہادی صلاحیت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ ابن خلدون کی طرح وہ بھی خلیفہ کا قریشی ہونا لازم نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ موقف بھی ہے کہ اہل سنت نے خلفائے راشدین کو مد نظر رکھتے ہوئے امیر کے لیے جن شرائط کا لزوم پیش کیا ہے وہ بعد کے حکمرانوں

1۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص6

2۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1999ء)، ص130

EIJ Rosenthal, Political thoughts in medieval Islam, Cambridge University Press, (1958), P. 40-41

Leonard Binder, Al-Ghazali's theory of Islamic governance, The Muslim World, (1995), P. 237-239

3۔ ابن خلدون، المقدمہ، (دار الجیل، بیروت، س۔ن)، ص215-217

میں موجود نہیں ہیں اس لیے اگر کسی امیر میں یہ تمام صفات موجود نہ ہوں تو اسی آدمی پر اکتفا کر لینا چاہیے جس میں یہ صلاحیتیں کم درجے پر پائی جائیں[1]۔

شاہ ولی اللہ نے بھی مسلمانوں کے حکمران کے لیے وہی اوصاف بیان کیے ہیں جو الماوردی نے لکھے ہیں۔ شاہ صاحب نے عمدہ شہرت کا ہونا بھی خلیفہ کے لیے لازم قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں فصاحتِ کلام کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ شاہ ولی اللہ کے مطابق اس شخص میں خاندانی وجاہت و شرافت کا پایا جانا بھی لازم ہے تاکہ کسی کو اس کی اطاعت کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہو[2]۔

وزارتوں کا تقرر

اسلامی ریاست میں تمام اختیارات امیر کے پاس ہوتے ہیں البتہ وہ امور مملکت کو انجام دینے کے لیے اپنے لیے معاونین کا تقرر کر سکتا ہے جن کو وزرا کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ان کو وزرا ہی کہا گیا ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ:

((إِذَا أَرَادَ اللهُ بِالأَمِيرِ خَيرًا، جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ صِدقٍ، إِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهُ، وَإِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ، وَإِذَا أَرَادَ بِهِ غَيرَ ذَلِكَ جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ سُوءٍ، إِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرهُ، وَإِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنْهُ))[3]

ترجمہ: جب کسی حکمران کے ساتھ اللہ تعالیٰ بہتری کرنا چاہتا ہے تو اس کو سچا وزیر دے دیتا ہے۔ اگر وہ بھول چوک کا ارتکاب کرے تو وزیر اس کو یاد دہانی کروا دیتا ہے۔ اگر اس کو یاد رہے تو وہ اس کی معاونت کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی حکمران کے ساتھ بہتری نہیں چاہتا تو وہ اس کو برا وزیر مہیا کر دیتا ہے۔ حکمران اگر بھول جائے تو وہ وزیر اس کو یاد دہانی نہیں کراتا ہے۔ اگر اس کو یاد رہے تو وہ وزیر اس کی مدد نہیں کرتا ہے۔

اس اعتبار سے حکومتی ڈھانچے کے ضمن میں امریکہ کا صدارتی نظام اسلامی سیاسی نظام کے ساتھ موافق ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد اسی موقف کے حامل ہیں۔ صدارتی نظام میں مملکت کے امور کی ذمہ داری صدر پر عائد ہوتی ہے اور اسلام میں بھی خلیفۃ المسلمین کاروبار حکومت کا ذمہ دار ہے۔ پارلیمانی طرزِ سیاست میں صدر پر ایسی ذمہ داری نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام میں اولوالامر کا مسلمان ہونا لازم ہے اور یہ صدارتی نظام میں آسانی کے ساتھ عمل میں آ سکتا ہے جس میں امرا کے پاس ولایت تو رہتی ہے لیکن حقیقی اقتدار ملک کے صدر کے پاس ہوتا ہے۔ دوسری

1۔ ابن تیمیہ، سیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، (المطبعۃ السلفیۃ، القاہرہ، 1399ھ)، ص9،8

Studies in muslin political thought, P: 177

Qamar Uddin Khan, The political thought of Ibn e Taymiyah, Islamic Research Institute, Islamabad, (1873), P: 143-149

2۔ شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء، ص:1/35،33،23،17۔ ص:2/332،330۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ترجمہ: مولانا عبد الرحیم، (قومی کتب خانہ، لاہور، 1983ء)، ص1/289۔ ص:2/604-606

3۔ ابو داؤد، سنن ابو داؤد، کتاب الخراج، باب فی اتخاذ الوزیر، ح2932

جانب پارلیمانی نظام میں اصل اقتدار پارلیمان کے پاس ہوتا ہے۔ پارلیمان میں کسی غیر مسلم کو شامل نہ کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے صدارتی نظام اسلام کے اصولِ سیاست کے زیادہ قریب ہے[1]۔

پارلیمان کی تشکیل

مجلس شوریٰ کے ارکان کی تعیین کے دو طریقے ہیں۔ پہلے طریقے کے مطابق سربراہ ریاست اپنی شورائی مجلس کے افراد کا تقرر خود کرتا ہے جب کہ دوسرے طریقے کے مطابق عوام الناس کے ووٹوں کے ذریعے اس مجلس کے ارکان منتخب کیے جاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ اہم امور میں اپنے ان معتمد صحابہ کرام کے ساتھ مشاورت کرتے تھے جو اپنے فہم و فراست اور اسلام کے ساتھ خلوص و قربانیوں میں امتیاز کے حامل تھے۔ یہ لوگ فطری طور پر منتخب تھے۔ سید مودودی کے مطابق اگر آج کے طریقہ انتخاب کے مطابق بھی ان کو پرکھا جاتا تو وہ ضرور منتخب ہو جاتے[2]۔ خلفا کے زمانے میں بھی یہی طریقہ رائج رہا تھا لیکن آج کل وہ طریقہ باقی نہیں رہا ہے اس لیے اب مجلس شوریٰ کے لیے افراد کا انتخاب کے ذریعے تقرر کیا جائے گا۔ انتخاب کے جدید طریقوں میں اسلامی تعلیمات کے مطابق ضروری اصلاحات کر کے ان کو اپنایا جا سکتا ہے۔ جدید طریقہ انتخاب اس ضمن میں زیادہ ممد و معاون ہے کیونکہ اس میں شوریٰ کی رکنیت کے امیدواروں کو اپنی اہلیت ثابت کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اس ضمن میں اسلام نے ایک اساسی اصول یہ طے کر دیا ہے کہ جو عہدہ طلبی والے اشخاص کو ایسا کوئی موقع نہیں دیا جانا چاہیے جس سے وہ پراپیگنڈہ کر کے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کریں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل حدیث سے رہنمائی ملتی ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((يا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بنَ سَمُرَةَ لا تَسْأَلِ الإمَارَةَ، فإنْ أُعْطِيتَهَا عن مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إلَيْهَا، وإنْ أُعْطِيتَهَا عن غيرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا، وإذَا حَلَفْتَ علَى يَمِينٍ فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا منها، فَأْتِ الذي هو خَيْرٌ، وكَفِّرْ عن يَمِينِكَ))[3]

ترجمہ: اے عبد الرحمان تم کبھی بھی حکومت کی طلب مت کرنا کیونکہ اگر طلب کرنے کے بعد وہ تمہیں دی گئی تو تم کو اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اگر وہ بغیر مطالبے کے تمہیں مل گئی تو تم اللہ تعالیٰ کی جانب سے مدد کیے جاؤ گے۔ جب تم قسم کھا لینے کے بعد دیکھو کہ دوسری چیزوں میں تمہارے لیے بھلائی ہے تو قسم توڑ کر اس کا کفارہ ادا کرو اور وہ کام کرو جس میں تمہارے لیے بھلائی ہے۔

1۔ مفتی محمد شفیع، دستور قرآنی، (ادارۃ المعارف، کراچی، 2003ء)، ص:18

2۔ مودودی، اسلامی ریاست، ص365، 364

3۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الأیمان والنذور، باب قول اللہ تعالیٰ {لا یؤاخذکم اللہ باللغو في أیمانکم}، ح6248

چنانچہ ایک موقف کے مطابق انتخاب کنندگان اپنی مرضی و منشا سے مجلس شوریٰ کے لیے نمائندوں کو منتخب کریں گے۔ اس سے ان جاگیرداروں اور روایتی و موروثی سیاست دانوں کے لیے اقتدار میں آنے کا راستہ مسدود ہو جائے گا جو اپنی قوت و دولت کے بل بوتے پر اعلیٰ مناصب پر قابض ہو جاتے ہیں۔ نیز اس طریقے سے جمہوری طرز کی جمہوریت مسلمانوں میں پھیلنے سے رک جائے گی اور یہ انتخابی طریقہ اس سے یکسر مختلف ہو گا۔ چنانچہ امیر کی جانب سے مجلس شوریٰ کے انتخاب کے حوالے سے عصر حاضر میں پیدا ہونے والی پیچیدگیاں سامنے نہ آسکیں گی[1]۔

اس کے علاوہ دوسرا موقف حکمرانِ ریاست کو اپنی شوریٰ کی مجلس کے ارکان کے انتخاب کا اختیار حاصل ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی نے اس موقف کو اختیار کیا ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کا یہی طریقہ تھا۔ وہ چیدہ چیدہ افراد کو اپنی نظر میں رکھتے تھے اور بوقتِ ضرورت ان سے مشورہ کرتے تھے[2]۔ مولانا محمد اسحاق سندیلوی کے مطابق علما کی ایک جماعت جس پر عوام کا بھی اعتماد ہو، کو مجلس شوریٰ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے عوام کی رائے لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ علماء خود ایسی مجلس کا انتخاب کر سکتے ہیں[3]۔

مجلس شوریٰ کے لیے جن لوگوں کا انتخاب کرنا ہو الماوردی کے مطابق ان میں تین اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے:

- وہ سب عادل ہوں۔
- ان کو امامت کی شرائط کا پتہ ہو اور وہ ان پر پرکھ کر امام کا انتخاب کر سکیں۔
- ان میں فکر اور دانائی ہو تاکہ وہ مملکت کو درپیش مسائل کا حل تلاش کر سکیں[4]۔

امام ابن تیمیہ کے مطابق شوریٰ کے لیے ان لوگوں کا انتخاب کرنا چاہیے جو قرآن و سنت کے ماہر ہوں نیز ان کو معاصر علوم پر بھی دسترس ہو تاکہ وہ صائب الرائے گروہ کے طور پر سامنے آسکیں[5]۔ مولانا محمد اسحاق سندیلوی کے

1۔ ڈاکٹر محمد ارشد لکھتے ہیں کہ مولانا ظفر احمد انصاری کی سربراہی میں ضیاء الحق نے ایک کمیشن بنایا تھا جا کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ اس کمیشن نے بھی صدر کو اپنی مجلس شوریٰ کے انتخاب کا اختیار دیا تھا لیکن علامہ محمد اسد کی جانب سے اس کی مخالفت کی گئی تھی اور انجوں نے سرکاری ٹیوی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں اس فیصلے کو شریعت کی روشنی میں چیلنج کیا تھا اور دعویٰ کیا تھا کہ ایسی مجلس شوریٰ جو عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل نہ ہو، اسلامی قانون کی رو سے اس کا بنانا جائز نہیں ہے۔ دیکھیے: بروایت ڈاکٹر محمد ارشد، رشید احمد جالندھری، ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 17 مارچ، 2003ء۔ (ڈاکٹر محمد ارشد، اسلامی ریاست کی تشکیل جدید، محمد اسد کے افکار کا تنقیدی مطالعہ، (الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، 2011ء)، ص 389

2۔ محمد ادریس کاندھلوی، دستور اسلام مع نظام اسلام، (مکتبۃ عثمانیہ، لاہور، س۔ن)، ص 85

3۔ اسحاق سندیلوی، اسلام کا سیاسی نظام، (نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1989ء)، ص: 172، 171

4۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، ص 7

5۔ ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیہ، ص 80

مطابق شوریٰ کے ارکان کے لیے بالغ، عاقل اور مسلمان ہونا لازم ہے۔ ان میں تفقہ فی الدین اور معاصر علوم میں مہارت لازم ہے[1]۔ مولانا ادریس کاندھلوی نے ان افراد کے لیے تجربہ کاری، عوام کی خیر خواہی کا جذبہ اور علم کے ساتھ ساتھ تقویٰ کا اعلیٰ معیار بھی شرائط میں شامل کیا ہے۔ نیز مولانا کاندھلوی نے تاکید کی ہے کہ مجلس شوریٰ میں عورتوں کو شامل نہیں رکھا جائے گا[2]۔

علامہ محمد اسد نے اس امر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ شوریٰ میں علماء کے علاوہ دیگر شعبہ ہائے حیات کے ماہرین کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے البتہ ان میں امت کی خیر کواہی، دانش مندی، متعلقہ شعبہ میں کامل مہارت اور دیانت داری کا ہونا لازم ہے[3]۔

مجلس شوریٰ کے کاموں کا دائرہ انتہائی وسیع ہے۔ چنانچہ سماجی، اقتصادی، جنگی، انتظامی اور سیاسی معاملات کے بارے میں اس سے مشاورت کرنا حکمرانِ وقت کی ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی، سماجی، عسکری، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی امور کے وہ پہلو جن کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہیں، سے متعلق قانون سازی بھی مجلس شوریٰ کی ذمہ داری ہے۔ حاکمِ وقت مجلس شوریٰ کے فیصلوں پر عمل کرنے کا پابند ہے یا نہیں، اس کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہیں۔ علماء کی ایک جماعت کے مطابق حکمران مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہے۔ ایک جماعت کے مطابق حاکم وقت اس پابندی سے آزاد ہے اور اس کے پاس ویٹو کا حق ہے۔ وہ چاہے تو مجلس کے اکثر ارکان کے فیصلے کو قبول کر کے، اقلیت کے فیصلے کو مان لے یا دونوں کو مسترد کر کے اپنی رائے پر عمل کرے[4]۔

ویٹو کا موقف رکھنے والے علماء کے گروہ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں لشکر اسامہ کی روانگی، مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کے وقت آپ رضی اللہ عنہ نے جمہور صحابہ کے مشورے کو مسترد کر دیا تھا۔ مغربی دنیا میں جب انتظامیہ اور مقننہ یعنی حکومت اور شوریٰ میں اختلاف پیدا ہو جائے اور کسی نکتہ

1۔ اسحاق سندیلوی، اسلام کا سیاسی نظام، ص198

2۔ ادریس کاندھلوی، دستور اسلام مع نظام اسلام، ص54، 53

3۔ محمد صادق قریشی، اسلامی طرز حکومت کے بارے میں علامہ اسعد کے مشورے، نوائے وقت میگزین، 26 اگست، 1983ء، ص9

4۔ اس بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے:

ابو فارس، حکم الشوریٰ فی الاسلام، (دار الفرقان، عمان، 1988ء)، ص89-95

سید سلیمان ندوی، سیرت النبی ﷺ، (دار المصنفین، اعظم گڑھ، 2003ء)، ص7/121

اسحاق سندیلوی، اسلام کا سیاسی نظام، ص175-178۔

مفتی محمد شفیع، مولانا حبیب الرحمان عثمانی، اسلام میں مشورہ کی اہمیت، (ادارہ اسلامیات، 1976ء)، ص153، 152

ڈاکٹر اسرار احمد، پاکستان میں نظام خلافت، (تحریک خلافت پاکستان 1994)، ص30

مولانا عبد الرحمان کیلانی، خلافت و جمہوریت، ص269-271

پر اتفاق نہ ہو سکے تو ایسی صورت میں وزارتوں پر براجمان لوگ استعفیٰ دے دیتے ہیں یا پارلیمنٹ کو تحلیل کر کے نئے انتخابات کروائے جاتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کو مد نظر رکھا جائے تو اس صورت میں ایک اعلیٰ ثالثی ٹربیونل یعنی دار القضائے عالی کی تشکیل کی جائے گی۔ یہ ٹربیونل ثالثی کا کردار ادا کرتے ہوئے قرآن و سنت اور قانون کی روشنی میں اختلاف کو حل کرے گا۔ یہ ٹربیونل ریفرنڈم کے ذریعے بھی مسئلہ حل نکال سکتا ہے۔ اگر استصوابِ رائے کا طریقہ اختیار کیا جائے اور یہ نتیجہ نکلے کہ امیر صریحا قرآن و سنت اور قانونِ مملکت کا مخالف بن رہا ہے تو اس کو معزول کر دیا جائے گا۔

عدالتی نظام کی تشکیل

اسلام نے عدالتوں کی تشکیل کے طریقہ کار کو مسلمان انتظامیہ کی حالات فہمی پر چھوڑ دیا ہے اور مجلس شوریٰ کو اجازت دی ہے کہ وہ حالات و واقعات کے تناظر میں جس طرح کا عدالتی نظام چاہیے اس کو نافذ کر لے بس شرط یہ ہے کہ اس کی بنیاد احکام شریعت پر ہونی چاہیے۔ نیز اسلامی ریاست میں مذہبی عدالت اور سیکولر عدالت کی دوئی کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ یہاں ہر جج شرعی اور دنیاوی امور کے فیصلے کرنے کا مجاز ہے۔ ان ججوں کی تیاری کے لیے ایک الگ ادارہ قائم کیا جانا چاہیے جس میں ان کے لیے دینی و دنیاوی امور کی تعلیم اور تخصص فی القانون کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق فقہ اسلامی کی تشکیلِ جدید کی جائے اور ججوں کو دی جانے والی تعلیم میں اس فقہی نصاب کو بطور خاص رائج کیا جائے[1]۔

اسلامی ریاست کا دفاعی نظام

اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ملکی دفاع اور استحکام کے لیے بری، بحری اور فضائی افواج تیار کرے اور ان کے لیے ایک بڑا بجٹ مختص کرے تاکہ مسلمانون کی حفاظت کا تسلی بخش انتظام کیا جا سکے۔ البتہ مسلمان فوج کی نوعیت دفاعی ہو گی یا ہنگامی، اس کے بارے میں حکمرانِ وقت حالات کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔

1۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامی دستور کی تدوین، (اسلامی پبلی کیشنز، لاہور، 2005ء)، ص: 12 تا 14

امین احسن اصلاحی، اسلامی قانون کی تدوین، (فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1998ء)، ص: 85 تا 105

امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل، (فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1998ء)، ص: 89 تا 116

خلاصہ بحث

اس مقالہ میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے سیاسی افکار کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں مولانا مودودی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی سوانح و خدمات اور اسلامی ریاست کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

پہلی فصل کے مطابق مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ مہاراشٹر میں 1903ء میں پیدا ہوئے۔ دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے طور پر قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا اور پھر دہلی میں مولانا شریف اللہ خان سے متداولہ علوم سیکھے۔ سیاسی زندگی کا آغاز انجمن اعانت بندان میں شمولیت سے کی اور 1941ء میں جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ قیام پاکستان کے بعد نفاذ اسلام کی تحریک چلائی جس کی پاداش میں کئی مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ آپ نے اخبار "مدینہ" اخبار "مسلم" سہ روزہ اخباری "الجمیعۃ" اور ہفت روزہ "تاج" میں بھی کام کیا۔ 1032ء کے بعد ترجمان القرآن کی ادارت کرتے رہے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے تقریباً دس ممالک کے دورے کیے اور دعوی عرب میں شاہ سعود کی دعوت پر ایک تعلیمی اسکیم کے ساتھ شاہی مہمان بھی بنے۔ آپ زندگی بھر مدینہ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کے رکن رہے۔ 1979ء میں آپ کو شاہ فیصل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اسی سال آپ کی وفات ہوئی۔ سید مودودی زندگی بھر تبلیغ و تصنیف میں مصروف رہے اور آپ نے پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ 1932ء میں حصار میں پیدا ہوئے اور میٹرک تک حصار میں ہی تعلیم حاصل کی۔ ابتدا میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ جماعت اسلامی کے حامی رہے اور اس کے بعد کچھ عرصہ کے لیے تبلیغی جماعت میں بھی شامل رہے تھے۔ انھوں نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس اور کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کیا۔ مفتی محمد شفیع اور مفتی محمد رفیع عثمانی کے حلقہ درس میں بھی شریک ہوتے رہے تھے۔ وہ جماعت اسلامی ساہیوال کے امیر رہے اور پھر 1956ء میں جماعت کی پالیسیوں سے اختلاف کی بنا پر الگ ہو گئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے دروس قرآن کا سلسلہ شروع کیا اور زندگی بھر دروس قرآن کے ذریعے دعوت و تبلیغ میں مصروف عمل رہے تھے۔ انھوں نے لاہور میں مستقل رہائش اختیار کرنے کے بعد وطنِ عزیز میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے منبر و محراب اور تحریر و تصنیف کو ذریعہ ابلاغ بنایا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے تنظیم اسلامی قائم کر کے کارکنوں کی تربیت کے لیے اجتماعات، دروس اور تربیتی نصاب کی نشر و اشاعت کی۔ تنظیم اسلامی کے علاوہ انہوں نے انجمن خدام القرآن، قرآن اکیڈمی، قرآن کالج اور تحریکِ خلافت بھی قائم کی۔ ملک کے صف اول کے ٹی وی چینلوں پر ان کی ویڈیوز نشر کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ اخبارات اور رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد 2010ء میں وفات پا گئے۔

دوسری فصل کے مطابق مشترکہ مقاصد کے لیے کسی علاقے کے باشندے اپنا اجتماعی نظام قائم کرلیں تو اس کو ریاست کہا جاتا ہے۔ اسلام میں ان مشترکہ مقاصد میں اللہ تعالیٰ کے اقتدار کو قولی و عملی طور پر تسلیم کرنا، اسلامی نظریاتی قانون کو نافذ کرنا، عبادات کے نظام کو قانونی طور پر نافذ کرنا، اسلام کی معاشی اقدار (صدقہ، زکوٰۃ، فطرانہ، عشر وغیرہ) کو قائم کرنا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مرتب و منظم کرنا، تجارتی امور میں دیانت داری کو یقینی بنانا، عدالتی نظاموں کو غیر جانب دار بنا کر انصاف کا بول بالا کرنا، خطہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی نیابت کا مظہر پیش کرنا، عوامی مشاورت کی بنیاد پر شورائی نظام قائم کرنا، انسانی جان، مال، عزت، نجی زندگی، افکار و نظریات کی ترویج کو تحفظ دینا، لوگوں کو مذہبی آزادی کا تحفظ فراہم کرنا وغیرہ شامل ہے۔

اسلامی ریاست حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی جامن ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست میں ہر فرد اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، ایک فرد کے فرم کا احتساب دوسرے فرد کے ساتھ نہیں کیا جاتا ہے۔ اسلامی ریاست میں کفالت عامہ کا نظام رائج ہوتا ہے جس کے تحت مفلس اور نادار طبقات کی معاشی اعانت کی جاتی ہے۔ یہاں قانون کی بالادستی ہوتی ہے اور حکمران طبقہ بھی رعایا سے اپنی اطاعت کروانے کے ساتھ ساتھ قانون کی بازپرس سے آزاد نہیں ہوتا ہے۔

دوسرے باب میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے افکار کی روشنی میں اسلامی ریاست کی نمایاں جہتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے مطابق اسلام کا سیاسی نظام آمریت اور اشتراکیت دونوں کے ساتھ ہی متعارض و متضاد ہے۔ اس کو ایک کلی نظام کی صورت میں سمجھنا چاہیے۔ اگر اس کو اکائیوں کی صورت میں سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو اکائیوں کے مابین ربط کو نظر انداز کرنے کی صورت میں غلطی ہو جائے گی۔ ان کا موقف ہے ہر کہ معاشرے میں کسی مقتدر ہستی یا خدا کا تصور موجود ہے۔ مسیحی پادریوں نے اپنے آپ کو اس مقتدر ہستی کا نائب قرار دے کر زمین پر پاپائیت کو فروغ دیا تھا جب کہ اسلام میں مذہبی اجارہ داری کا سرے سے کوئی تصور ہی موجود نہیں ہے۔ البتہ اسلامی نظریہ اقتدار کو سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے حاکمیت الہیہ کا نام دیا ہے۔ چنانچہ حکومت و قانون سازی کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور دنیا میں انسانوں کے ذریعے چلائی جانے والی تمام حکومتیں نہ صرف دنیاوی بلکہ مذہبی اعتبار سے بھی عوام کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی ہیں۔ اسی مناسبت سے اسلام میں سیاسی پارٹیوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

سیاسی حالات و واقعات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلامی ریاست میں کوئی اہل اور قابل انسان اپنے آپ کو اعلیٰ عہدے کے حصول کے لیے پیش کر سکتا ہے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اسلامی ریاست میں منصوص قوانین کو نافذ کرنے اور نئے مسائل، جن کے بارے میں شریعت خاموش ہے، کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ ان کو اجماع

امت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسلامی ریاست کی حکومت ان لوگوں کو ہی سونپی جا سکتی ہے جو اسلامی نظریہ حیات پر کامل یقین رکھتے ہیں اور ان کا مرد ہونا، عاقل و بالغ ہونا اور اسلامی ریاست کا شہری ہونا لازم ہے۔ یہ بھی لازم ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں میں مبتلا نہ ہوں اور جسمانی طور پر صحت مند ہوں۔ وہ دینی و دنیاوی علوم سے بہرہ ور ہوں اور کردار کے اعتبار سے بہترین لوگ ہوں کسی بھی شخص کو رنگ، نسل، علاقے یا زبان کی بنا پر نہیں بلکہ اسلام کی بنا پر انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ میں شامل کیا جائے گا اور اسی بنا پر اس کو اس کے عہدے سے برخاست کر دیا جائے گا۔ اسلامی ریاست کے فرائض میں جو چیزیں شامل ہیں ان میں متوازن زندگی، اجتماعی عدل، انتظامی سطح پر عبادات کا نظام، معاشی نظام کو خیر اور نیکی کی بنیاد پر تشکیل دینا اور دعوت و تبلیغ کے نظام کو قائم کرنا شامل ہے۔ اسلامی ریاست میں حکومت عوام الناس کی جانب سے بطور اعتماد ایک نمائندے کو سونپی جاتی ہے اس لیے حاکم کی حیثیت مقتدر کی نہیں بلکہ خادم کی ہے۔ اس لیے حاکم دینی قانون کے نفاذ میں آزاد اور مختار ہے لیکن زندگی کے دیگر امور میں وہ عوام کو مجبور کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ وہ کسی کو کسی ایک پیشے کے انتخاب پر مجبور نہیں کر سکتا ہے۔

سید مودودی کے مطابق عوام پر لازم ہے کہ وہ حکمران کی اطاعت و فرماں برداری کرے البتہ اس ضمن میں "معروف" کا بھرپور لحاظ رکھا جائے۔ اگر حکمران طبقے کی جانب سے کسی برائی کے ارتکاب کا حکم دیا جائے تو عوام اس معاملے میں نافرمانی کی راہ اختیار کریں گے۔ اسی طرح قانون سازی کے معاملے میں اگر عوام کو محسوس ہو کہ حکمران شریعت اسلامیہ کی طے کردہ حدود سے تجاوز کر رہا ہے تو وہ اس کے ساتھ اختلاف ظاہر کرنے کے بھی مجاز ہیں۔ سید مودودی نے اسلامی ریاست کی شہریت اور قومیت پہ بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان کا تصور قومیت مغربی قومیت کے تصور سے کلی طور پر مختلف ہے۔ مغرب میں رنگ، نسل، زبان، جغرافیہ وغیرہ کی بنیاد پر انسانی قومیت تشکیل دی گی ہے۔

مولانا مودودی کا موقف ہے کہ اسلام ان تمام معیارات کی نفی کرتا ہے اور صرف دین و مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کو ایک امت کی صورت میں مجتمع ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ انھوں نے واضح کیا ہے کہ مغربی قومیت کا تصور انسانی طبقات کو نفرت کے رشتے میں جوڑتا ہے جس کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر قتل و غارت، تعصب اور مالی استحصال سامنے آتا ہے۔ محض نسلوں کی بنا پر لوگوں کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے سے انسانی وقار اور احترام بری طرح مجروح ہو جاتا ہے۔ تمام انسان آدم و حوا کی اولاد ہونے کے ناتے سے برابر ہیں۔ انسان جس زمین پر پیدا ہوتا ہے اس کا رقبہ بمشکل ایک گز ہوتا ہے۔ اس لیے وطنیت کا تصور انتہائی محدود ہے۔

زبان کی بنیاد پر لوگوں کو تقسیم کرنا درست نہیں ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایک زبان بولنے والے کسی ایک نکتے پر دس الگ الگ خیالات کے حامل ہوں اور الگ الگ زبانیں بولنے والے ایک ہی نکتے پر متفق ہوں۔ اس طرح

کے تصور قومیت کی بنیاد پر کسی قوم کو مختصر وقت کے لیے ایک نکتے پر اکٹھا کیا جا سکتا ہے البتہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ اکٹھ مستقل ہو گا بلکہ اس اکٹھ میں بغاوتوں کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام رنگ، نسل، زبان اور وطنیت کو محض انسانوں کے تعارف کی حیثیت دیتا ہے اور اس سے بڑھ کی اس کو کسی بھی قسم کی اہمیت دینے والے کو جاہلیت کا مرتکب قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید میں مسلمانوں کے لیے حزب اور امت کا نام استعمال کیا ہے اور ان کو ایک جماعت قرار دیا ہے۔ انھوں نے عہد نبوی ﷺ سے ایسی کئی مثالوں کو پیش کیا ہے جو معاصر تصور قومیت کو مسترد کرنے میں دلائل کا کام دیتی ہیں۔ مولانا مودودی کے مطابق اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے اخراجات پورے ہو جانے کے بعد باقی بچ جانے والے اموال پر ٹیکس عائد ہو گا۔

تیسرے باب میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے تصورات کے مطابق اسلامی ریاست کے خدوخال پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف کے نزدیک صدارتی نظام اسلامی سیاسی روح کے مطابق ہے کیونکہ اسلامی خلافت کے جملہ اختیارات خلیفہ کے پاس ہوتے ہیں اور صدارتی نظام میں یہی اختیارات صدرِ مملکت کے پاس ہوتے ہیں۔ مجلس شوریٰ خلیفہ کی معاونت پر مامور ہوتی ہے البتہ اس کے پاس اختیارات نہیں ہوتے ہیں۔

مروجہ جمہوریت میں پارلیمنٹ اختیارات کی حامل ہوتی ہے اور اس کے ارکان کی ایک مخصوص تعداد کی رضا مندی کے بغیر کوئی بھی قانون منظور نہیں کروایا جا سکتا ہے۔ صدارتی نظام میں صدر کسی بھی سرکاری ادارے کے زیر اثر نہیں ہوتا ہے اور اس وقت یہ پوری کامیابی کے ساتھ امریکہ میں چل رہا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد مروجہ پارلیمانی جمہوریت کو مسترد کرتے ہیں اور ان کا موقف ہے کہ اس میں انتظامیہ اور مقننہ آپس میں گڈمڈ ہو جاتی ہے اور سیاسی پارٹیوں کے رہنما کسی نظام کے تحفظ کے بجائے محض اپنے نمائندوں کو اپنے ساتھ مضبوطی سے جوڑ کر رکھنے میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے یہ نظام قابل اعتماد نہیں ہے۔

دوسری جانب وہ یہ بھی تجویز دیتے ہیں کہ صدر کے تقرر کے لیے انتخابات کا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے اور اس میں تمام شہریوں کی شمولیت کو یقینی بنایا جانا چاہیے۔ اس میں متقی اور غیر متقی کی تمیز نہیں کی جائے گی البتہ عہدے تفویض کرتے وقت اخلاق و کردار کو معیار بنایا جائے گا۔ ان کے اخلاق و مردار کی صفائی کو جانچنے کا طریقہ یہ ہے کہ امیدوار انتخابی کمیٹی کے سامنے پیش ہو کر اپنے مالی اثاثوں کا مکمل ریکارڈ پیش کر کے ثابت کرے کہ وہ کسی خیانت کا مرتکب نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح پارلیمنٹ یعنی مجلس شوری کی رکنیت کے حامل کے لیے ضروری ہے کہ وہ اچھے کردار کا حامل ہو، اس کے بارے میں اسلام شکنی کی کوئی مثال موجود نہ ہو، وہ دینی علوم کا ماہر ہو۔ عملی طور پر اسلامی فرائض پر عمل کرنے والا ہو اور کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرنے والا ہو۔ قانون سازی کے ضمن میں ڈاکٹر اسرار احمد منصوص

قوانین کی قطعیت کے قائل ہیں البتہ نئے مالی، سیاسی، معاشرتی اور دیگر مسائل کے حل کے لیے وہ اجتہاد کی راہ تجویز کرتے ہیں اور اجتہاد کے ضمن میں وہ علامہ اقبال کی طرح پارلیمانی اجتہاد کے قائل ہیں۔ وہ ان لوگوں پر تنقید کرتے ہیں جن کے مطابق علامہ اقبال کا تصور اجتہاد صحیح نہیں ہے۔

اسلامی ریاست کے معاشی نظام کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ یہاں معیشت مادیت اور روحانیت کے اعتبار سے چلتی ہے۔ انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کے ان اوصاف کا ذکر بھی کیا ہے جن سے عموماً مسلمان علما نے صرف نظر کیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر کوئی بھی فرد لامتناہی دولت کا مالک بن سکتا ہے۔ اشتراکیت اسی وجہ سے ناکام ہو گئی تھی کہ اس میں ہر فرد کا معاوضہ معین کر دیا گیا تھا اور لوگوں کی ذاتی املاک کو قومیت کی تحویل میں لے لیا گیا تھا۔ پاکستان میں جن کمپنیوں کو سرکاری تحویل میں لیا گیا تھا ان کی ناکامی کا بھی یہی سبب تھا کہ لوگ محض معاوضے کو مد نظر رکھ کر کام کرتے تھے جب کہ نجی کمپنیاں تاحال ترقی کرتی جا رہی ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں رسد زیادہ جب کہ طلب کم ہونے کی بنا پر اشیاء کی قیمتوں میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس طرح حکومتوں کو چیزوں کی مصنوعی مہنگائی کا چیلنج درپیش نہیں ہوتا ہے۔ اس میں صرف خدمات پیش کرنے والا ہی نہیں بلکہ خدمات حاصل کرنے والا بھی Hire and Fire کی پالیسی کے مطابق آزاد ہوتا ہے۔ البتہ یہ بھی اہم ہے کہ اسلام سرمایہ داری کے بارے میں نہیں بلکہ سرمایہ کاری کے بارے میں تعلیمات دیتا ہے۔ سرمایہ داری دولت جمع کرنے کی جب کہ سرمایہ کاری دولت کو مارکیٹ میں خرچ کرنے کی سائنس ہے۔ انھوں نے شراکت اور مضاربت کی تاکید ہے اور مزارعت کو اسلام کے معاشی نظام سے متعارض و متضاد قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق مسلمانوں سے زکوۃ، صدقات، خراج اور عشر کی مد میں ٹیکس لیا جائے گا جب کہ غیر مسلموں سے جزیہ اور ان کی زمینوں کا خراج لیا جائے گا۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے مروجہ بینکاری کو سودی ہونے کی بنا پر ناجائز قرار دیا ہے اور ان لوگوں پر تنقید کی ہے جو بیع مؤجل کے تصور کی بنیاد پر اس کے جواب کا حیلہ تلاش کرتے ہیں۔ اپنے افکار و نظریات کی روشنی میں اسلامی ریاست کے خدوخال بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے انقلاب و جہاد کا ایک مخصوص تصور بھی پیش کیا ہے جس کی رو سے غلبہ اسلام کے امکانات سامنے آسکتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد کے مطابق پہلے ایک مضبوط اسلامی نظریے کی تشکیل کی جائے گی۔ دوسرے مرحلے میں اس نظریے کی نشر و اشاعت کی جائے گی۔ تیسرے مرحلے میں اس نظریے کو قبول کرنے والوں کی تربیت کا اہتمام کیا جائے گا۔ ان کارکنان کو دعوت و تبلیغ پر مامور کیا جائے گا اور چوتھے مرحلے میں ان کارکنان کو دعوت و تبلیغ کے بدلے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا وہ ان پر صبر و استقامت کا مظاہرہ کریں گے۔ پانچویں مرحلے میں اس تشدد کی بنا پر دنیا کی طرف سے ہمدردیاں میسر آئیں گی اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو گا جس کے بعد وہ اقدامی کاوش کے ذریعے تصادم

کی راہ اپنا کر باطل سے ٹکرا جائیں گے۔اس طرح مقامی سطح پر اسلام غالب ہو جائے گا۔چھٹے مرحلے میں اسلام کی توسیع کے لیے عالمی سطح پر کام کیا جائے گا۔

چوتھے باب میں ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودی کے تصورات کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر اسرار احمد مولانا مودودی کی علمیت اور منقبت سے متاثر تھے اور اس بات کا اظہار انہوں نے کئی مقامات پر کیا ہے۔اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔اس نکتے پر ڈاکٹر اسرار احمد اور سید مودودی دونوں متفق ہیں۔البتہ مروجہ جمہوریت کے معاملے میں ڈاکٹر اسرار احمد اور سید مودودی کا نقطہ نظر الگ الگ ہے۔سید مودودی اس کے حامی جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد اس کے مخالف ہیں۔انھوں نے عمومی جمہوریت جس میں مسلمان اپنی آراء کی روشنی میں کسی قانون کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنائیں تو وہ بھی تھیوکریسی والا شرک کہلائے گی البتہ اگر کسی جمہوری نظام سے قبل اس بات پر اجماع ہو جائے کہ ہر آئین و دستور اسلامی شریعت کی رو سے طے پائے گا تو پھر اس جمہوریت کو شرک نہیں قرار دیا جائے گا۔اس کی گنجائش ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاں موجود ہے۔سید مودودی پارلیمانی جمہوریت کے حامی ہیں جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد اس کو مسترد کرتے ہیں۔وہ وفاقی کے بجائے وحدانی اور صدارتی حکومت کی تائید کرتے ہیں جب کہ سید مودودی کے مطابق آمریت اور فرد واحد کا اختیار غلط ہے۔سید مودودی حکمران کو مجلس شوریٰ کے مشوروں پر عمل کرنے کی تاکید کرتے ہیں جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد کا موقف ہے کہ اگر حکمران کے پاس شوریٰ کے مشورے سے زیادہ بہتر راستہ ہو تو اس پر شوریٰ کی بات ماننا لازم نہیں ہے۔

مغربی کی جانب سے آنے والا تصور "مذہب انسان کا نجی معاملہ ہے" دونوں حضرات کی جانب سے مسترد کر دیا گیا ہے کیونکہ دونوں کے نزدیک دین ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس لیے اس میں کسی فرد کو مذہب پر عمل کرنے یا عمل نہ کرنے میں آزادی نہیں دی جاسکتی ہے۔دونوں حضرات اس موقف پر متفق ہیں کہ حکمران کی اطاعت و فرمان برداری لازم ہے البتہ فسق و فجور کے حکم کی نافرمانی بھی فرض ہے۔اگر حکمران اسلام مخالف پالیسیاں اپنانا شروع کر دے تو مسلمانوں پر اس کے خلاف خروج ضروری ہو جاتا ہے۔اسلامی ریاست کی حکمرانی کے ضمن میں دونوں حضرات کا موقف ہے کہ یہ ایک نظریاتی ریاست ہے اس لیے اس میں حکمرانی کا حق صرف اسی کو حاصل ہے جو اس کے نظریے پر ایمان رکھتا ہے۔کوئی غیر مسلم، اسلامی ریاست کا حکمران نہیں بن سکتا ہے۔

سید مودودی اور ڈاکٹر اسرار کے مطابق غیر مسلموں کو اسلامی ریاست میں تعلیم اور تجارت کی مکمل آزادی ہو گی۔دونوں علماء نے مقننہ کے بنائے ہوئے قانون کو بھی نظر ثانی کے قابل قرار دیا ہے اور عدالتوں کو اس اختیار کا حامل گردانا ہے کہ وہ مقننہ کے بنائے ہوئے ان قوانین کو رد کر سکتی ہیں جو اسلامی شریعت کے ساتھ متصادم ہو گا۔اپنے نظریات کے پرچار کے لیے قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں بھی سید مودودی نے تحریر و تقریر کی راہ اپنائی

اور انتخابات میں حصہ لیا۔ انہوں نے نفاذ اسلام کے لیے ملک میں ریلیاں نکالیں اور جلسے منعقد کیے جن کی پاداش میں ان کو کئی مرتبہ پابند سلاسل کیا گیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر اسرار احمد بھی سید مودودی کے حامی رہے لیکن بعد میں جمہوریت پسندانہ پالیسیوں کے ساتھ اختلاف کرتے ہوئے وہ جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے اور انہوں نے تنظیمِ اسلامی قائم کر کے دعوت و تبلیغ کے ذریعے زندگی بھر نفاذ شریعت کی حساسیت کو اجاگر کیا۔

نتائج بحث

اس مقالہ کی تحقیق کے دوران مندرجہ ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

1۔ جمہوریت اور خلافت دو نظاموں میں ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودی کے نزدیک حاکمیت اعلی صرف اللہ تعالیٰ کی ہو گی۔

2۔ ڈاکٹر اسرار احمد صدارتی نظام کو خلافت کے قریب تر قرار دیتے ہیں۔

3۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک اقامت دین کے لئے جہاد بنیاد ہے۔

4۔ مولانا مودودی پارلیمانی نظام کے ذریعے عام دین کی بات کرتے ہیں۔

5۔ دونوں مفکرین کے نزدیک اقلیتوں کے مال و جان کی ذمہ دار حکومت ہے۔

6۔ مولانا مودودی کی رائے کے مطابق سربراہ مملکت شوریٰ کے فیصلے کو ماننے کا پابند ہے جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد کے نزدیک سربراہ مملکت کے پاس شوریٰ کے فیصلے کے بعد بھی صوابدیدی اختیار ہے۔

7۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے رائے کے مطابق ابتدائی مرحلے میں لوگوں کی تربیت کرنا ہے اور پھر تربیت یافتہ لوگوں کے بل بوتے پر حکومت سازی کے اقدامات کرنا ہے۔

8۔ دونوں مفکرین کے نزدیک اقامت دین کی ذمہ دار ریاست ہے۔

9۔ دونوں مفکرین عورت کو بحیثیت سربراہ حکومت تسلیم نہیں کرتے۔

سفارشات

اس مقالہ کی تحقیق کے دوران کئی ایسے پہلو سامنے آئے جن پر مزید تحقیق ہونی چاہیے۔

1۔ حاکمیت اعلیٰ کے تصوّر کو صاحب اقتدار لوگوں کے لئے واضح طور پر پیش کرنے کی ضرروت ہے۔

2۔ معاشرے کو بہتر بنانے کے لئے بنیادی اور ابتدائی سطح سے تربیت دئے جانے کا عمل شروع کیا جانا چاہئے۔

3۔ ریاستی سطح سے اسلام کو معاشرے میں نظریاتی بنیادوں پر پیش کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔

4۔ مولانا مودودی سے اختلاف کرنے والی شخصیات کے افکار کا افکار کے تقابلی جائزہ پیش کیا جانا چاہئے۔

5۔ اپنے سیاسی افکار اور تصور انقلاب کی بنا پر ڈاکٹر اسرار احمد علماء کی نظروں میں رہے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے افکار سے متعلق معاصر اسلامی سیاسی مفکرین کی آراء کس نوعیت کی ہیں۔

6۔ یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ برس ہابرس کی تعلیم و تبلیغ کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد کے پیروکار تا حال کس سطح کا سیاسی کردار پیش کر سکے ہیں اور پاکستانی سیاست پر ان کے افکار کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

7۔ دونوں مفکرین کے نظریات کے اثرات پاکستانی سیاست کے تناظر میں جانچے جانے چاہئے۔

8۔ دونوں مفکرین کے پیش کردہ سیاسی نظریات کا برصغیر کے دیگر علماء کے سیاسی نظریات سے تقابلی جائزہ پیش کیا جانا چاہئے۔

فہارس

فہرست آیات

نمبر شمار	آیت	سورۃ	آیت نمبر	صفحہ نمبر
1	وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ	البقرۃ	31	26
2	وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا	"	188	30
3	لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ	"	256	34
4	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا	"	208	78
5	وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ.....	"	219	113
6	قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ ...	آل عمران	26	19
7	كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ.....	"	110	23
8	وَ شَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِۚ.....	"	159	28
9	قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا	"	64	72
10	اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّه لِلّٰهِ.....	"	154	73
11	مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ	"	79	74
12	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ	النساء	29	30
13	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ	"	59	37
14	وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ	"	64	74
16	وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللَّهَ	المائدہ	42	25
17	لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى لِسَانِ دَاوُودَ.....	"	78	33
18	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ	"	2	39
19	إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ	"	33	38
20	وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ.....	"	44	73
21	وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ	الانعام	108	35
22	وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ	"	164	36
23	ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ	"	102	72

24	أُولَئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ.....	"	89	75
25	وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ	الاعراف	10	26
26	فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنْجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ	"	165	34
27	وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ	"	85	38
28	اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ.....	"	54	71
29	يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ	"	157	72
30	وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا	يونس	99	35
31	إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ	يوسف	40	73
32	قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ	"	55	76
33	وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ	النحل	116	73
34	وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ	الاسراء	35	24
35	وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَنْ.....	بنی اسرائیل	33	29
36	مَنِ اهْتَدَى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا	"	15	36
37	وَقُلْ رَبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ	"	50	75
38	الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُاد.....	الحج	41	19
39	أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ.....	"	65	26
40	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ.....	النور	27	31
41	وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ	"	55	76
42	وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ	العنكبوت	46	34
43	وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ	"	61	65
44	وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ.....	الروم	31	20
45	فَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ.....	"	38	108
46	يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ	ص	26	21
47	وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ	الشوری	38	26
48	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى	الحجرات	11	31

49	وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ.....	الذاريات	19	37
50	لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ	الحديد	25	20

فہرست احادیث

نمبر شمار	حدیث کا متن	کتاب کا نام	صفحہ نمبر
1	اِسمَعُوا وَاَطِيعُوا وَلَو استَعمَلَ عَلَيكُم عَبد حَبشِی.....	صحیح البخاری	81
2	إِذَا أَرَادَ اللهُ بِالأَمِيرِ خَيرًا، جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ صِدقٍ،	سنن ابی داود	167
3	لَيْسَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ إِلَّا تَرْكُ الصَّلَاةِ	سنن ابی داود	21
4	لَيْسَ بَيْنَ الْعَبْدِ وَالشِّرْكِ إِلَّا تَرْكُ الصَّلَاةِ، فَإِذَا تَرَكَهَا فَقَدْ أَشْرَكَ	سنن ابن ماجه	21
5	مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ.....	صحیح مسلم	24
6	مَن أطَاعَنِي فقَدْ أطَاعَ اللَّهَ، ومَن عَصَانِي فقَدْ عَصَى اللَّهَ.....	صحیح البخاری	90
7	وَايْمُ اللَّهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعَ مُحَمَّدٌ يَدَهَا.....	صحیح مسلم	24
8	يا عَبْدَ الرَّحْمَنِ بنَ سَمُرَةَ لا تَسْأَلِ الإمَارَةَ،	صحیح البخاری	168

فہرست اعلام

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر
1	ابن تیمیۃ	18
2	ابو الاعلیٰ مودودی	5
3	ابو الحسن الماوردی	18
4	ابو الخیر مودودی	7
5	اشفاق الرحمٰن کاندھلوی	6
6	اسرار احمد	2
7	اظہار احمد	10
8	امین احسن اصلاحی	128
9	ایوب خان	130
10	اجمل خان	136
11	تقی عثمانی	11
12	حمید الدین	5
13	خورشید احمد	143
14	خالد محمود	136
15	حضرت داؤد علیہ السلام	20
16	رفیع عثمانی	11
17	سید احمد حسن	5
18	سر سید احمد خان	5
19	حضرت سلیمان علیہ السلام	19
20	سید محمد شاہ	127
21	سید عبد العزیز شرقی	127
22	سید سلیمان ندوی	122

23	شریف اللہ	6
24	شاہ ولی اللہ	16
25	حضرت شعیب علیہ السلام	24
26	شبیر احمد عثمانی	128
27	ضیاء الحق	14
28	ظفر احمد انصاری	128
29	حضرت علی رضی اللہ عنہ	5
30	عبد السلام نیازی	6
31	عاکف سعید	15
32	امام غزالی	81
33	فردوسی بیگم	12
34	لیاقت علی خان	128
35	محمد اقبال	58
36	محمد شفیع	11
37	حضرت موسیٰ علیہ السلام	20
38	محمد صدیق	127
39	میاں طفیل محمد	127
40	ملک غلام علی	127
41	محمود احمد	136
42	نعیم صدیقی	127
43	چودھری نیاز	6
44	حضرت یوسف علیہ السلام	20
45	یحییٰ خان	132

فہرست اماکن

نمبر شمار	نام جگہ	صفحہ نمبر
1	اورنگ آباد	5
2	ارباط	7
3	استنبول	7
4	بھوپال	5
5	پٹھان کوٹ	6
6	ٹورنٹو	7
7	جمال پور	6
8	جدہ	7
9	حیدر آباد	5
10	دہلی	5
11	دمشق	7
12	ساہیوال	11
13	علی گڑھ	5
14	عمان	7
15	قاہرہ	7
16	کویت	7
17	کراچی	11
18	کرشن نگر	10
19	گورداسپور	12
20	لاہور	6
21	لندن	7
22	مکہ	7

23	مدینہ	7
24	مصر	7
25	ملتان	128

فہرست مصادر و مراجع

1) القرآن الکریم

2) احادیث مبارکہ

3) ابن تیمیہ، سیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، (المطبعۃ السلفیۃ، القاہرہ، 1399ھ)

4) ابن عابدین، محمد امین بن عمر بن عبد العزیز عابدین دمشقی ، رد المختار علی الدر المختار، (دار الفکر، بیروت، 2000ء)

5) ابو الکلام آزاد، مسئلہ خلافت، (دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہاوس، 1987ء)

6) ابو نصر محمد بن محمد بن ترخان بن اوزلغ فارابی، آراء اہل المدینہ الفاضلۃ، (مصر: المطبع السعادہ، 1906ء)

7) اردو لغت تاریخی اصول پر، وفاقی وزارت تعلیم، (اردو لغت بورڈ، کراچی، 1992ء)

8) اسعد گیلانی، سید مودودی، دعوت و تحریک، (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 1986ء)

9) امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل، (فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1998ء)

10) پروفیسر سید محمد سلیم، مولانا مودودی کا مذہب عالم کا مطالعہ، ماہنامہ افکارِ معلم (نومبر 1996ء)

11) پروفیسر محمد سرور، مولانا مودودی کی تحریک اسلامی، (لاہور: دار الکتاب، کتاب مارکیٹ، اردو بازار، 2004ء،)

12) تبسم کاشمیری، ڈاکٹر اقبال، تصور قومیت اور پاکستان، (مکتبہ عالیہ لاہور، 1977ء)

13) چوہدری عبد الرحمان، مفکر اسلام سید ابو الاعلیٰ مودودی (اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 1988ء)

14) خالد سلیم منصور، وثائقِ مودودی، (ادارہ معارف اسلامی، لاہور)

15) خرم بدر، سید مودودی کی سیاسی زندگی، (صبا پبلی کیشنز، کراچی، 1988ء)

16) ڈاکٹر اسرار احمد، تاریخ جماعت اسلامی ایک گم شدہ باب (مرکزی انجمن خدام القرآن)

17) ڈاکٹر اسرار احمد، حقیقت و اقسامِ شرک، (لاہور: مکتبہ خدام القرآن)

18) ڈاکٹر اسرار احمد، اطاعت کا قرآنی تصور، (لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن)

19) ڈاکٹر اسرار احمد، بیان القرآن، (انجمن خدام القرآن، پشاور)

20) ڈاکٹر اسرار احمد، حِزبُ اللہ کے اوصاف (لاہور: مرکزی انجمن خدام القرآن)

21) ڈاکٹر اسرار احمد، منہج انقلاب نبوی، (شعبہ تنظیم اسلامی، لاہور، 2008ء)

22) ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام کا معاشی نظام، (مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور)

23) ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام میں عدل اجتماعی، (مکتبہ خدام القرآن، لاہور، 2001ء)

24) ڈاکٹر اسرار احمد، پاکستان میں نظامِ خلافت کیوں اور کیسے (مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، 2005ء)

25) ڈاکٹر اسرار احمد، جہاد فی سبیل اللہ،،(لاہور: مکتبہ خدام القرآن، 1999ء)
26) ڈاکٹر اسرار احمد، دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر،(مرکزی انجمن خدام القرآن)
27) ڈاکٹر اسرار احمد، رسول انقلاب کا طریقِ انقلاب،(مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور)
28) ڈاکٹر اسرار احمد، سانحہ کربلا،(لاہور: مکتبۃ خدام القرآن، 1983ء)
29) ڈاکٹر اسرار احمد، مطالبات دین،(شعبہ تنظیم اسلامی، پاکستان، 2008ء)
30) ڈاکٹر اسرار احمد، اسلام میں عورت کا مقام،(انجمن خدام القرآن، لاہور)
31) ڈاکٹر اسرار احمد، تحریک جماعت اسلامی، ایک تحقیقی مطالعہ،(لاہور: انجمن خدام القرآن)
32) ڈاکٹر اسرار احمد، حساب کم و بیش،(لاہور: انجمن خدام القرآن)
33) ڈاکٹر اسرار احمد، تنظیم اسلامی کی دعوت،(لاہور: انجمن خدام القرآن)
34) ڈاکٹر اسرار احمد، اَربعینِ نَوَوِی،(لاہور: مکتبہ خدام القرآن)
35) ڈاکٹر اسرار احمد، انفرادی نجات اور اجتماعی فلاح کیلئے قرآن کا لائحہ عمل،(لاہور: خدام القرآن، 2001ء)
36) ڈاکٹر اسرار احمد، بصائر،(لاہور: مکتبہ خدام القرآن)
37) ڈاکٹر اسرار احمد، نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں،(لاہور: مکتبہ خدام القرآن، 1399ھ)
38) رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار،(ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، 1999ء)
39) سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامی دستور کی تدوین،(اسلامی پبلی کیشنز،، لاہور، 2005ء)
40) سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست،(اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 2000ء)
41) سید ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن،(ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 2004ء)
42) سید ابو الاعلیٰ مودودی، تنقیحات،(لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، 1358ھ)
43) سید ابو الاعلیٰ مودودی، خلافت و ملوکیت،(ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 1992)
44) سید ابو الاعلیٰ مودودی، مسئلہ قومیت،(ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 1941ء)
45) سید ابو الاعلیٰ مودودی، مسئلہ ملکیت زمین،(اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، 2007)
46) سید ابو الاعلیٰ مودودی، معاشیاتِ اسلام،(اسلامک پبلی کیشنز، لاہور 2013ء)
47) سید ابو الاعلیٰ مودودی، رسائل و مسائل، حصہ اول،(لاہور: اسلامک پبلی کیشنز لمڈیڈ، 1388ھ)
48) سید قطب، العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام،(بیروت: دار الشرق، 1975ء)
49) سید قطب، فی ظلال القرآن،(قاہرہ: دار الشروق)

50) شاہ عبد العزیزی، فتاویٰ عزیزی، (مطبع مجتبائی، دہلی، 1341ھ)
51) شاہ ولی اللہ دہلوی، ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء، (دمشق: دار القلم، 1434ھ)
52) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، (بیروت: دار الجیل، 1426ھ)
53) عبد الرحمان کیلانی، تیسیر القرآن، (مکتبۃ السلام، لاہور، 1432ھ)
54) علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، (الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، 2006ء)
55) علی سفیان آفاقی، سید ابو الاعلیٰ مودودی، (لاہور، سندھ ساگر اکیڈمی 1958ء)
56) غزالی، محمد بن محمد بن محمد الغزالی، التبر المسبوک فی نصیحۃ الملوک، (دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، 1988ء)
57) غلام رسول سعیدی، شرح صحیح مسلم، (لاہور: فرید بک سٹال، 2013ء)
58) قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، (الجامعۃ السلفیۃ المحمدیۃ، قاہرہ، 1967ء)
59) قرطبی، محمد بن احمد القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، (دار احیاء التراث العربی، بیروت، 1985ء)
60) الماوردی، ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب بصری الماوردی ، الاحکام السلطانیۃ، (لاہور: قانونی کتب خانہ، 2015ء)
61) محمد یوسف، مولانا مودودی اپنی اور دوسروں کی نظر میں، (البدر پبلی کیشنز، لاہور، 1955ء)
62) مفتی محمد شفیع، دستور قرآنی، (ادارۃ المعارف، کراچی، 2003ء)
63) مودودی، ابو الاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن، (لاہور: ادارہ ترجمان القرآن)
64) مودودی، سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلام کا نظریہ سیاسی، (بریلی: بریلی الیکٹرک پریس)
65) مولانا محمد تقی امینی، احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت، (اسلامک بک کارپوریشن، اسلام آباد، 1992)
66) وحید الزمان قاسمی، القاموس الوحید، (ادارہ اسلامیات، لاہور، 2001ء)

1) Amr Hamzawy. *Opposition in Egypt in Policy Outlook*. Carnegie Endowment for Peace, Washington, 2005
2) Anzia Ayyubid. *Over- Stating the Arab State*. London: B Tauris Press 1995
3) Cengiz Candar. *Redefining Turkey's Political center*. Journal of Democracy, October: 99, 129
4) David Potter . *Explaining Democratization*. Cambridge: Polity Press 1997
5) Freedom House, Egypt, Annual Country Report, Freedom House, Washington, 2007

6) Human Rights Commission of Malaysia, Annual Report, Kuala Lumpur, 2007
7) Huseyin Alaz, what is being done on Human Rights and Democracy in Turkey, The World Movement on Democracy, World Movement of Democracy, Istanbul, 2006

8) Issaka Souaré, Egypt, the Political Process between Opening Up and Control, Situation Report, 9 April 2008 by Institute of Security Studies, South, Institute of Security Studies, Pretoria, Africa
9) Laza Kekic. *The Economist Intelligence Unit's Index of Democracy*. London: , 2007
10) Rainer Heufers. The Politics of Democracy Malaysia, Asian Numbers, Vol 85, October 2002
11) Rainer Heufers. *The Politics of Democracy Malaysia*. Journal of Asian, Vol 85. October 2002

12) Reporters Without Borders, Paris, 2007)
13) Robert Dahl. *Democracy and its Critics*. Yale University press 1989
14) RS. Milne. *Malaysian Politics under Mahatir*. London , Routledge 1999
15) Sanjeev Miglani, Malaysian Elections. Are They Fair? Reuters, Vol 6, March 2008
16) Sarwat Saulat, *Maulana Maududi*, International Islamic Publisher, Karachi (Nov 1979)

17) Suaram. *Civil and Political Rights Report of Malaysia*. Kula Lumpur Suaram 2008